ایک تمنا ایک خواب

گیجو بھائی بدھیکا



ایک تمنا ایک خواب

(ایک ماہر تعلیم کے منصوبے)

گیجو بھائی بدھیکا

ترجمہ

طاہرہ حسن



نیشنل بک ٹرسٹ، انڈیا

یہ کتاب تشکیل ثانی کاغذ پر شائع کی گئی ہے

ISBN 81-237-1581-1

پہلا اردو ایڈیشن 1996 (ساکا 1917)

Original Title : DIVASVAPNA (Gujrati)

Urdu Translation : EK TAMANNA EK KHWAB

قیمت : 31.00

ناشر: ڈائرکٹر نیشنل بک ٹرسٹ انڈیا

اے‘۵ ۔گرین پارک‘ نئی دہلی ۱۱۰۰۱۶

فہرست

پیش لفظ

کوئی ڈیڑھ سو برس گذرے نو آبادیاتی حکومت نے چھوٹے بچوں کے ہندوستانی ٹیچر کو ایک مجبور اور بے حس زندگی قبول کرنے پر مجبور کیا تھا۔ اب بھی ہمارے اساتذہ ایسی ہی زندگی بسر کررہے ہیں۔ اس عرصے میں اسکولی نظام ایسا پھیلا کہ تعلیم ملک کے کونے کونے میں پہونچ گئی۔ لکھوکھا بچوں کے لئے اب اسکے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ وہ بے پروائی کا شکار ہوں۔

ظاہر ہے، شاید ہی کوئی ایسا ٹیچر ہو جو بچوں کی تربیت، انھیں اردگرد کی دینا سے الگ رکھ کر کچھ کرنا چاہتا ہو۔ مگر ہمارے ملک میں اسکولی تہذیب کا تقاضہ ہے کہ بچوں کی دلچسپی کی ہزاروں چیزوں، کیڑوں سے لے کر ستاروں تک کو، کلاس کی پڑھائی سے بے تعلق سمجھا جائے۔ ایک عام ٹیچر یہ سوچ کر کام کرتا ہے کہ اسے بس نصابی کتاب سے پڑھانا ہے اور بچوں کو امتحان کے لیے تیار کرنا ہے۔ اسے یہ محسوس نہیں ہوتا کہ بچوں میں جاننے کی خواہش ابھارنا بھی اس کی ذمہ داریوں میں شامل ہے۔ اور نہ اسکولوں ہی میں ایسے حالات پیدا کئے جاتے ہیں جن میں ٹیچر یہ ذمہ داری پوری کر سکے۔

ان حالات میں ضروری معلوم ہوتا ہے کہ دیو اسپنا (جسے اردو میں ایک تمنا ایک خواب کا نام دیا گیا ہے) پھر شائع کیا جائے اور لوگوں تک پہونچایا جائے جو گجرات کے مشہور ماہر تعلیم اور معلم گیجو بھائی بدھیکا، (1885 تا 1939) کا نظریہ ہے۔ یہ کتاب پہلی بار 1932 میں گجراتی زبان میں شائع ہوئی تھی۔ اسی سال مدھیہ پردیش کے مشہور ماہر تعلیم کاشی ناتھ ترویدی نے دیواسپنا کو ہندی میں شائع کرنے کی پہل کی تھی۔ ترویدی جی نے گاندھی جی سے یہ سبق سیکھا تھا کہ صحیح عمل کا تقاضہ ہے کہ اس کی کامیابی کے لیے انتھک صبر سے کام لیا جائے۔ ان کا یہ خواب کہ تعلیم پر گیجو بھائی کی تحریروں کو وسیع

پیمانے پر لوگوں تک پہونچایا جائے، اب تکمیل کے کچھ قریب آگیا ہے ۔ لیکن یہ خواب کہ طریقہ تعلیم میں تبدیلی ہو، اسی وقت پورا ہوسکتا ہے جب گاندھی جی، ٹیگور اور گیجو بھائی کے بتائے ہوئے راستے پر طویل جد وجہد کی جائے گی ۔ ان تینوں نے تعلیم کے جو اصول مرتب کئے ہیں، وہ بچوں کے لئے آزادی اور خود اعتمادی کے ماحول کی ضرورت پر اصرار کرتے ہیں ۔ گیجو بھائی نے 1920 میں اپنا بال مندر قائم کرکے اس تصور کو ایک ادارے کی شکل دی اور اپنی تحریروں کے ذریعے اس کے مختلف پہلو روشن کیے ۔ دیوا سپنا ایک ایسے ٹیچر کی فرضی کہانی ہے جو پرانی تعلیمی تہذیب کو رد کرتا ہے ۔ ٹیچر میں بچوں کے لئے جوش وخروش باقی رہتا ہے ۔ وہ تجربہ کرتا رہتا ہے اور تعلیم کے روائتی طریقوں اور نصابی کتابوں کو جان بوجھ کر نظر انداز کرتا ہے ۔ اس کے تجربوں کا اصولی پس منظر تو مونٹیسری کا طریقہ ہے لیکن اس کی تیاری اور عمل بالکل مقامی ہے ۔

دیوا سپنا پڑھیے تو آپ خوشی اور جستجو کے زبردست جھونکے میں اڑنے لگتے ہیں اور وہ افسردگی پیچھے چھوٹ جاتی ہے جو ہندوستان کے بے رنگ اور دھول میں لپٹے ہوئے اسکولوں کی جانکاری سے آپ کے دل میں پیدا ہوئی ہے ۔ آپ مستقبل کی ایک ایسی تصویر بنانے لگتے ہیں جس میں ہماری قوم کے اسکولوں کی جیل میں بند لیاقت، دیواریں توڑ کر باہر نکل آئے گی اور بچے ٹیچر کے ساتھ مل کر اپنے درجوں کے چاروں طرف کی دینا کا پر لطف جائزہ لے کر خوش ہوں گے ۔

دلی

20 جولائی 1989

کرشن کمار

پہلا حصہ

تجربہ شروع ہوتا ہے

1

میں نے اس بارے میں پڑھا اور سوچا تو بہت تھا لیکن میرا کوئی عملی تجربہ نہیں تھا۔ مجھے ایسا لگا کہ خود اپنا کچھ تجربہ ضرور ہونا چاہئے تب ہی میرے اپنے خیالات کوئی شکل اختیار کریں گے اور پختہ بنیں گے اور تب ہی مجھے یہ پتہ چلے گا کہ ان میں کتنی سچائی ہے یا پھر وہ بالکل کھوکھلے اندازے ہی ہیں۔

میں محکمہ تعلیم کے بڑے افسر کے پاس گیا اور ان سے درخواست کی وہ تجربہ کرنے کے لیے مجھے کسی پرائمری اسکول کی ایک کلاس سونپ دیں۔ افسر ہنسے اور بولے:

"بس رہنے ہی دیجیے۔ آپ سے یہ کام نہیں بنے گا۔ بچوں کو پڑھانا اور وہ بھی پرائمری سطح پر کوئی ہنسی کھیل نہیں۔ یہ کام تو بڑا ہی کٹھن ہے۔ آپ ٹھہرے غور وفکر کرنے والے آدمی اور ادیب۔ آرام دہ کرسی پر بیٹھ کر تیزی سے مضمون لکھ دینا بڑا آسان ہوتا ہے اور خود پڑھتے ہوئے سوچ لینا بھی سہل ہے، لیکن اپنے خیالات کو عملی جامہ پہنانا اور تجربے کو کامیابی سے پورا کر لینا انتہائی مشکل ہوتا ہے۔"

میں نے کہا: "اسی وجہ سے تو میں ذاتی تجربہ کرنا، اور اصلیت کی بنیاد پر نتیجہ اخذ کرنا چاہتا ہوں۔"

آخر کار افسر تعلیم راضی ہو گئے۔

انہوں نے کہا: "اچھا، اگر آپ کی اتنی ہی زیادہ خواہش ہے تو پھر ایک سال تجربہ کر کے ضرور دیکھ لیجئے۔ میں ایک پرائمری اسکول میں آپ کے لیے چوتھی کلاس کو پڑھانے کا انتظام کر دوں گا۔ لیجئے یہ ہے نصاب کی ایک کاپی۔ یہ ہیں نصابی کتابیں، اور یہ رہے چھٹیوں اور دوسرے متعلقہ معاملوں کے بارے میں محکمہ تعلیم کے قاعدے قانون۔" میں نے بڑے اشتیاق سے ان چیزوں کو دیکھا اور نصاب اٹھا کر جیب میں رکھ لیا۔ جوں ہی میں نے نصابی

کتابوں کا بنڈل بنانا شروع کیا، افسرِ تعلیم بولے : "دیکھئے آپ جو کریں لیکن مہربانی کر کے یہ بات دھیان میں رکھئے کہ تعلیمی سال ختم ہونے پر امتحانات ہوں گے اور ان کے نتیجے دیکھ کر ہی آپ کا کام جانچا جائے گا۔"

"منظور ہے۔" میں نے جلدی سے جواب دیا اور بولا : میری ایک درخواست ہے آپ سے ۔میں چاہتا ہوں صرف آپ ہی امتحان لیں اور میرے کام کو جانچیں ۔ آپ مجھے تجربہ کرنے کی اجازت دے رہے ہیں ،ظاہر ہے کہ میں براہ راست آپ کو ہی اپنا کام دکھانا چاہوں گا۔ مجھے لگتا ہے آپ ہی میری کامیابی اور ناکامی کی وجوہات سمجھ سکیں گے چاہے جو بھی ہوں۔"

افسرِ تعلیم اپنی رضامندی دیتے ہوئے مسکرائے اور میں ان کے دفتر سے باہر نکل آیا۔

II

میں نے سارا نصاب دیکھ ڈالا۔ مجھے پکا یقین تھا کہ اس میں کچھ تبدیلیاں کر کے اسے بہتر بنایا جاسکتا تھا۔میں نے نصابی کتابیں دیکھیں ۔ آسانی سے پتہ چل گیا کہ ان میں کیا اچھائیاں تھیں اور کیا نہیں ۔میں نے وہ تبدیلیاں بھی سوچ لیں جو ان میں کی جاسکتی تھیں۔

بس یوں سمجھئے پہلے دن سے لے کر آخری دن تک کے کام کے پلان کا سارا خاکہ میری نظروں کے سامنے تھا۔میں نے ان تمام دنوں کی گنتی کا حساب بھی لگالیا جو امتحانات اور ان کے نتائج نکلنے وغیرہ میں لگتے تھے ۔ پورا منصوبہ تیار نظر آرہا تھا ۔ اتنے دن کام ہوگا، یہ سارا کام کس طریقے سے کیا جائے گا اور اس کا کیا نتیجہ نکلے گا۔میں اپنے خیالوں میں اس قدر کھویا ہوا تھا کہ کچھ احساس ہی نہ ہوا کہ رات بیت چکی ہے اور دو (2) بج رہے ہیں ۔میں نے اگلے دن کے لیے اپنے نوٹس تیار کئے ۔جب سونے کے لئے اٹھا تو رات کے تین بج چکے تھے۔

جب صبح ہوئی تو میرے اندر جوش اور ولولہ تھا، خوداعتمادی تھی اور کام شروع کرنے کی خواہش بھی ۔میں نے نہا دھو کر ناشتہ کیا اور وقت سے کچھ پہلے ہی اسکول نمبر تین

پہونچ گیا۔ ابھی اسکول کا پھاٹک نہیں کھلا تھا۔ ہیڈماسٹر صاحب بھی نہیں آئے تھے۔اسکول کا چپراسی کنجی لینے ان کے گھر گیا ہوا تھا۔ بچے اسکول پہونچنا شروع ہو گئے تھے اور سڑکوں پر ادھر ادھر دوڑ بھاگ مچائے ہوئے تھے۔

میں بڑی بے چینی سے اسکول کھلنے کا منتظر تھا۔سوچ رہا تھا کہ کب میری کلاس شروع ہو اور میں کام شروع کروں ، کب اپنے نئے منصوبوں پر عمل کروں ، کب درجے میں پڑھانے کے کام کو دلچسپ بناؤں اور اپنے شاگردوں کا دل موہ لوں ۔اس وقت خون میری شریانوں میں تیزی سے گردش کر رہا تھا۔

گھنٹی بجی۔ لڑکے اپنے اپنے درجوں میں جا کر بیٹھ گئے ۔ہیڈماسٹر صاحب مجھے میرے درجے میں لے گئے اور لڑکوں سے میرا تعارف کرایا۔

"سنو بچو"! آج سے شری لکشمی رام تمھارے کلاس ٹیچر ہیں ۔ تمھیں ان کی ہر بات ماننا ہوگی ۔ دیکھو، کوئی شرارت یا اودھم بازی نہ ہو۔" انھوں نے کہا۔

میں نے ان بچوں پر نگاہ ڈالی جو اگلے بارہ مہینے میری نگرانی میں رہیں گے ۔ میں نے دیکھا کہ ان میں بعض تو مسکرا رہے تھے ،بعض ایک دوسرے کو آنکھ مار رہے تھے ۔ کچھ نے ذرا اینٹھتے ہوئے انداز میں سر ہلالیا۔ایک دو نے میری طرف بناوٹی حیرت سے دیکھا اور بقیہ بالکل ہی بے نیاز کھڑے رہے۔



ان مسخرے شریر بچوں کو دیکھ کر دل تھوڑا سا ڈر گیا۔

میں کھڑا دیکھتا رہا۔ "تو یہ ہیں وہ بچے جنھیں پڑھانا ہوگا۔ یہ عجیب وغریب مسخرے لڑکے!" میں نے دل ہی دل میں سوچا۔ میں تھوڑا سا گھبرایا لیکن پھر سنبھل گیا۔ میں نے اپنے آپ سے کہا: "ارے گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ میں دھیرے دھیرے ان سب کو سنبھال لوں گا۔"

میں نے اپنی جیب سے وہ پرچہ نکالا جس پر رات کو میں نے نوٹس لکھے تھے اور اپنے کام کی فہرست پر ایک نگاہ دوڑائی۔ لکھا تھا:- پہلے خاموشی کا کھیل۔ پھر درجے کی صفائی کی جانچ، اس کے بعد کورس (سہ گان) اور آخر میں لڑکوں کے ساتھ بات چیت۔

میں نے لڑکوں سے کہا: "آؤ بچو خاموشی کا کھیل کھیلیں۔ میں کہوں گا، اوم شانتی، تو تم لوگ بالکل چپ چاپ رہنا۔ پھر میں دروازہ بند کردوں گا اور کمرے میں اندھیرا ہوجائے گا۔ چونکہ ہم سب بالکل چپ چاپ ہوں گے تو ہمیں اپنے آس پاس اور باہر کی آوازیں صاف سنائی دیں گی۔ یہ بڑا مزے دار کھیل ہوگا۔ تمھیں مکھیوں کی بھنبھناہٹ تک سنائی دے گی۔ تم اپنی سانس کی آواز بھی سن سکوگے۔ اس کے بعد میں ایک گانا گاؤں گا۔ تم بس سنتے رہنا۔"

اپنی بات ختم کرکے میں نے کھیل شروع کردیا۔ میں نے 'اوم شانتی' کہا لیکن لڑکے باتیں کرنے اور دھکا مکی میں لگے رہے۔ 'اوم شانتی' میں نے باربار دوہرایا لیکن اس کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ میں تھوڑا گھبرایا۔ میں ان پر چلا تو نہیں سکتا تھا کہ "چپ رہو۔ تمیز سے بیٹھو۔"

میں ان سے زور زبردستی سے تو حکم نہیں منوا سکتا تھا۔ چنانچہ میں نے کھیل جاری رکھا۔ میں نے آگے بڑھ کر دروازہ اور کھڑکیاں بند کردیں۔ اب کمرے میں بالکل اندھیرا ہو گیا۔ لڑکوں نے خود اپنا ہی کھیل شروع کردیا۔ کچھ لڑکوں نے 'ملکے سروں میں ہوں۔ اوں۔ اوں۔' کا شور مچایا۔ کچھ نے طرح طرح کی آوازیں نکالنا اور کچھ نے اپنے پیروں سے دھم دھم کرنا شروع کردیا۔ اتنے میں ایک لڑکے نے تالی بجائی اور پھر سبھی تالیاں بجانے لگے۔ تب کوئی ہنسا اور پوری کلاس ہنسنے میں اس کے ساتھ ہو گئی۔ میں سناٹے میں آگیا اور پیلا پڑ گیا۔ میں نے ساری کھڑکیاں کھول دیں اور کچھ دیر کے لیے باہر چلا گیا۔ واپس آیا تو پوری کلاس بری طرح اودھم مچا رہی تھی۔ لڑکے ایک دوسرے سے میری نقل کرتے ہوئے، اوم شانتی۔

اوم شانتی، کہہ رہے تھے اور کچھ کھڑکیاں بند کررہے تھے۔

میں نے سوچا: میرے نوٹس تو بے کار ہی گئے۔ ان پر عمل نہیں ہوسکتا۔ گھر پر بیٹھے بیٹھے نوٹس تیار کرکے خیال ہی خیال میں پڑھا دینا تو آسان ہے لیکن عملاً یہ بڑا کٹھن کام ہے۔ جو بچے اب تک شور ہنگامے اور اودھم بازی کے بیچ پلے ہیں، ان کے سامنے ابھی خاموشی کے کھیل کی بات کرنا ہی مہمل ہے۔ خیر اب میں پھر سے شروعات کروں گا، وہیں سے جہاں سے غلطی ہوئی ہے۔ ایک طرح سے اچھا ہی ہوا کہ میں پہلے ہی قدم پر پھسل گیا۔ اب کل سے ایک نیا طریقہ اپناؤں گا — میں نے لڑکوں سے کہا: "بچو آج اور کام نہیں ہوگا۔ اب ہم کل ملیں گے۔ آج تم لوگ چھٹی مناؤ۔"

چھٹی کا لفظ سنتے ہی لڑکے چھٹی--- چھٹی چلاتے اور اچھلتے کودتے درجے سے باہر نکل گئے۔ انھوں نے اس قدر کود پھاند کی اور شور مچایا کہ دوسرے درجوں کے ٹیچر اور لڑکے حیران ہوکر سوچنے لگے کہ آخر قصہ کیا ہے۔ ہیڈ ماسٹر صاحب بھی اپنے کمرے سے نکل آئے اور انھوں نے بھنویں تان کر پوچھا: "آپ نے لڑکوں کو چھٹی کیسے دیدی۔ ابھی تو دو گھنٹے کی دیر ہے۔" وہ بہت غصہ میں تھے۔

میں نے کہا: "جی بچے آج سیکھنے کے موڈ میں نہیں تھے۔ وہ کچھ بےچین سے تھے۔ خاموشی کے کھیل کے دوران میں نے اندازہ لگایا تھا۔"

ہیڈ ماسٹر صاحب نے کڑی آواز میں کہا: "لیکن آپ بغیر پوچھے لڑکوں کو اس طرح چھٹی نہیں دے سکتے۔ اگر ایک درجے کے بچے اس طرح چھوڑ دئیے جائیں تو دوسرے درجوں کے بچوں کے کام میں رکاوٹ پڑے گی اور پڑھائی نہیں ہوسکے گی۔ آپ کو اس طرح کے تجربوں کی اجازت نہیں دی جاسکتی۔" انھوں نے ذرا رعب سے کہا: "آپ نہ سیکھنے کے موڈ وغیرہ کی بات بھول جائیے۔ خاموشی کا کھیل مونٹیسری اسکول کے لیے تو اچھا ہو سکتا ہے لیکن پرائمری اسکولوں میں تو ایک کراری چپت سب لڑکوں کو فوراً خاموش کردے گی۔ میری مانیں تو آپ بھی لڑکوں کو اسی طرح پڑھائیں جیسے دوسرے ٹیچر پڑھاتے ہیں تاکہ سالانہ امتحان میں آپ کچھ نتیجہ دکھا سکیں۔ آج کا دن تو آپ نے گنوا ہی دیا۔ الّو بنے سو الگ۔"

ہیڈ ماسٹر صاحب پر مجھے بڑا رحم آیا۔ میں نے کہا: "جناب! چپت مار مار کر پڑھانے

کا کام تو دوسرے لوگ کر ہی رہے ہیں اور اس کا پھل بھی صاف نظر آرہا ہے کہ لڑکے بالکل جنگلی، بد تمیز، اور بے چین قسم کے ہوگئے ہیں ۔ نچلے نہیں بیٹھتے ۔میں تو یہ بھی دیکھ رہا ہوں کہ یہاں ان چار برسوں کی تعلیم کے دوران انھوں نے یہی سیکھا ہے کہ ٹیچروں کے سامنے ہاہا۔ہوہو کریں، اودھم مچائیں، تالیاں بجائیں اور پیر پٹکیں ۔اسکول تو انھیں پسند ہی نہیں ۔ دیکھئیے نا جونہی انھیں خبر ملی کہ آج ان کی چھٹی ہے، کیسا خوش ہوکر اچھلتے کودتے بھاگ گئے" ! ہیڈ ماسٹر صاحب اس سچائی سے انکار نہ کرسکے اور بولے : "اچھا یہ بات ہے ؟ چلئے دیکھتے ہیں ۔ آپ اس بارے میں کیا کرتے ہیں ۔"

میں کچھ افسردہ سا گھر لوٹا ۔اور بیٹھ کر سوچنے لگا: "واقعی کام مشکل اور آزمائش سخت ہے ۔خیر کچھ بھی ہو میں ہمت نہیں ہاروں گا۔مجھے معلوم ہونا چاہئے تھا کہ 'خاموشی' کا کھیل اس طرح نہیں کھیلا جاتا۔ مونیٹسری اسکولوں میں یہ کھیل شروع کرنے سے پہلے اس کی تیاری کی جاتی ہے ۔میری ہی بیوقوفی تھی جو پہلے دن ہی یہ کھیل شروع کردیا۔ پہلے تو مجھے اپنے شاگردوں کے بارے میں اچھی طرح جاننا چاہئے تھا اور ان کے ساتھ جان پہچان بڑھانی اور دوستی کرنی چاہئے تھی ۔تب ہی تو وہ میری بات سنتے اور جو کچھ میں کہتا وہ کرتے ۔ ان لڑکوں کو اسکول تو اچھا ہی نہیں لگتا، انھیں چھٹی پیاری ہے ۔ان کے ساتھ کام کرنا لوہے کے چنے چبانا ہے ۔

میں نے اگلے دن کے کام کا پلان بنایا اور پھر سوگیا۔ ساری رات دن میں ہوئے واقعات اور اگلے دن کے کام کا خواب دیکھنے میں ہی بیت گئی۔



دوسرے دن جب اسکول کا گیٹ کھلا تو میں وہاں موجود تھا۔ کلاس میں لڑکوں نے مجھے گھیر لیا۔ وہ چلا رہے تھے : "ماسٹر صاحب کل کی طرح آج بھی کیوں نہ ہماری چھٹی ہو جائے ؟ جناب مہربانی ہوگی آج کے دن بھی چھٹی کردیں ! چھٹی ۔چھٹی ــــ " "اچھی بات

ہے ۔"میں نے جواب دیا۔ "آج بھی تمھیں چھٹی دیدوں گا لیکن سارے دن کی نہیں ۔بس دو گھنٹے کی ۔لیکن ٹھہرو۔ پہلے میں تم لوگوں کو ایک کہانی سناتا ہوں ۔باقی باتیں بعد میں ہوں گی میں نے کہانی شروع کردی :ایک تھا راجا۔اس کی تھیں سات رانیاں۔ ساتوں رانیوں کے ایک ایک شہزادہ اور ایک ایک شہزادی تھی ------"

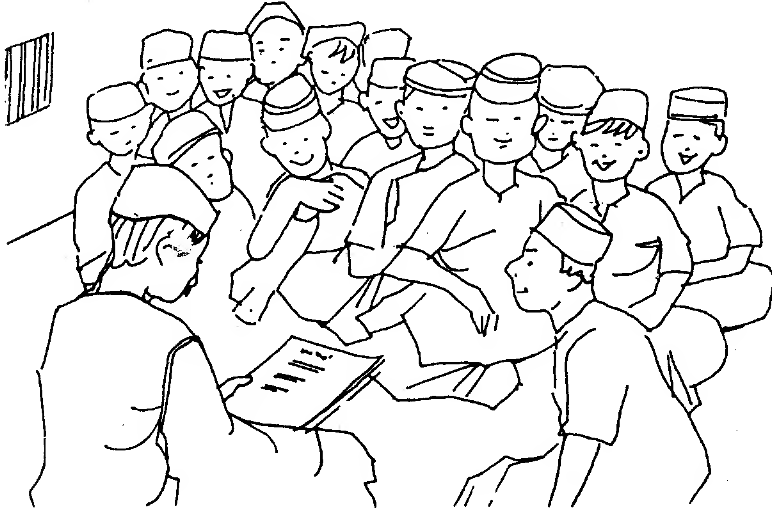
سارے لڑکے کہانی سننے کے لیے مجھے گھیر کر بیٹھ گئے ۔بیٹھتے ہوئے انھوں نے کچھ ہو ہلا اور دھکا مکی کی تو میں نے کہا : "دیکھو بھئی یہ بات تو ٹھیک نہیں ۔سب لوگ آرام سے بیٹھو ۔ایسے تو کام نہیں چلے گا۔"

سب لڑکے ذرا ٹھکانے سے بیٹھ گئے ۔

"ہاں تو کہئیے نہ کہانی ۔پھر کیا ہوا؟" وہ بولے ۔

میں مسکرایا اور کہانی شروع کردی ۔ "ان ساتوں شہزادیوں کا اپنا ایک ایک محل تھا اور ہر محل کے باغ میں موتیوں کے سات سات پیڑ-----"

لڑکے محویت کے عالم میں کہانی سن رہے تھے ۔درجے میں بالکل سناٹا تھا۔ نہ تو کوئی آواز تھی اور نہ ہی کوئی حرکت۔ مکمل خاموشی سے ہیڈ ماسٹر صاحب کو بڑی حیرت ہوئی



لڑکے پھٹی آنکھوں سے کہانی سننے لگے ۔ساری کلاس میں سناٹا چھا گیا۔ نہ کوئی بولتا تھا، نہ ہلتا تھا۔

اور وہ یہ دیکھنے کہ آخر ماجرا کیا ہے، درجے میں داخل ہوئے۔ "کہئے آپ کہانی سنا رہے ہیں؟" انھوں نے مجھ سے سوال کیا۔

"جی ہاں کہانی ہی ہے۔ اور 'خاموشی' کے کھیل کی ایک نئی قسم۔" میں نے جواب دیا۔

ہیڈ ماسٹر صاحب واپس لوٹ گئے۔ میں نے کہانی جاری رکھی۔ قریب کے درجے میں کچھ شور ہوا۔ میں نے لڑکوں کی توجہ اس کی طرف دلاتے ہوئے کہا: "دیکھو شور کیسا خراب لگتا ہے۔" سب لڑکوں نے اس سے اتفاق کیا۔ جب کہانی آدھی ہوگئی تو میں رک گیا اور بولا: "کیوں بھائی اگر چھٹی چاہتے ہو تو پھر اب یہاں ہی ختم کر دوں کہانی؟ یا پھر آگے سناؤں!"

"نہیں -- نہیں کہانی سنائیے۔ کہانی سنائیے۔ ہمیں چھٹی نہیں چاہئے۔" سب ایک ساتھ بول پڑے۔

"اچھی بات ہے۔ پھر تو میں کہانی سناؤں گا۔ لیکن آؤ پہلے کچھ دیر بات چیت کرلیں۔ پھر اسکول کی گھنٹی بجنے تک کہانی ہی سناتا رہوں گا۔" میں نے جواب دیا۔
ایک لڑکا بولا: ماسٹر صاحب، بات چیت کل کریں گے۔ آج کہانی ہی سنائیے تاکہ ہم لوگ پوری کہانی سن لیں۔"

"بھئی کہانی تو اتنی لمبی ہے کہ چار دن تک چلے گی۔" میں نے کہا۔
لڑکے بولے: "افوہ اتنی لمبی! پھر تو بڑا ہی مزا آئے گا۔ اتنے میں میں نے حاضری کا رجسٹر نکال لیا اور لڑکوں کے نام لکھے۔ نام لکھنے کے بعد ان کی حاضری لی۔ یہ سارا کام جھٹ پٹ اور بڑی اچھی طرح ہوگیا۔ پھر میں نے کہا۔" دیکھو۔ اب سے ہم روزانہ پہلے حاضری لیا کریں گے اور پھر کہانی ہوگی۔" یہ کہہ کر میں نے کہانی سنانا پھر شروع کر دیا۔ اور اس وقت تک سناتا رہا جب تک کہ اسکول ختم ہونے کا آخری گھنٹہ نہیں بج گیا۔ اسکول کا وقت ختم ہوچکا تھا لیکن لڑکے اس کے بعد بھی کہانی سننے کی خاطر ٹھہرنا چاہتے تھے۔
لیکن میں نے کہا: "بس بھائیو آج بہت ہو گئی کہانی۔ باقی اب کل۔ اچھا یہ تو طے کرلیں کہ کل تم لوگ چھٹی چاہتے ہو یا کہانی سنوگے؟" "کہانی" - پوری کلاس نے ایک ساتھ چلا کر کہا۔ جب بچے کمرے کے باہر جانے لگے تو لفظ 'کہانی' برآمدے میں گونج رہا تھا۔

"شکر خدا کا" میں نے کہا۔ "آج کا دن تو ضائع ہونے سے بچ گیا۔ کہانی تو جادو کر دیتی ہے! یقیناً یہ بات سولہ آنے سچ ہے۔"

IV

دوسرے دن جب میں درجے میں داخل ہوا تو لڑکوں نے چاروں طرف سے مجھے گھیر لیا۔ سب کے سب مسکرا رہے تھے اور اصرار کر رہے تھے: "ماسٹر صاحب چلئے کہانی سنائیے۔"
میں نے انھیں یاد دلایا: نہیں پہلے حاضری پھر کچھ بات چیت اور تب کہانی۔ میں نے اپنی جیب سے کھریا کا ایک ٹکڑا نکالا اور اس سے فرش پر ایک بڑا سا گولا کھینچ دیا اور بولا۔ "دیکھو روز آکر اس گولے کے چاروں طرف بیٹھنا۔" یہ کہتے ہوئے میں بیٹھ گیا اور کہا۔ "اس طرح! یہ جگہ میری ہے اور یہیں بیٹھ کر میں کہانی سنایا کروں گا۔"
لڑکے بیٹھ گئے۔ میں نے حاضری لی اور کہانی سنانا شروع کر دی۔ وہ سب بڑے اشتیاق سے سن رہے تھے اور کہانی سننے میں اس قدر محو جیسے کسی نے ان پر جادو کر دیا ہو! ایک وقت میں کہانی کہتے کہتے رک گیا اور پوچھا: "کیوں؟ کیا تم لوگوں کو اچھی لگ رہی ہے؟"
"جی ہاں۔" سب ایک ساتھ بول پڑے۔ "بہت اچھی لگ رہی ہے۔ بہوت زیادہ اچھی۔" "اچھا تمھیں کہانی سننا تو بڑا اچھا لگ رہا ہے۔ کیا کہانی پڑھنا بھی چاہو گے؟" "جی"۔ وہ سب چلائے۔ "ہم پڑھنا بھی چاہیں گے۔ لیکن قصے کہانی کی کتابیں ہیں کہاں جو ہم پڑھیں؟"
"اچھا اگر میں کہانی کی کتابیں لادوں تو کیا تم لوگ پڑھوگے؟"
"جی پڑھیں گے۔ ضرور پڑھیں گے۔"
اتنے میں ایک چالاک لڑکا بول اٹھا۔ "لیکن آپ کو تو ہمیں کہانیاں سنانی ہی ہوں گی۔ ہمارا

کہانیاں پڑھ لینا کافی نہیں ہو گا۔"

"اچھا ٹھیک ہے ۔"میں نے جواب دیا اور کہانی سنانا پھر شروع کر دیا۔

اسکول کی گھنٹی بجی ۔سب بچے مجھے گھیر کر کھڑے ہو گئے۔ کچھ میری طرف محبت بھری نظروں سے دیکھ رہے تھے، کچھ نے میرا ہاتھ چھونے کی کوشش کی اور بعض ایسے کھڑے تھے جیسے سکتے میں ہوں ۔میں نے کہا: "جاؤ اسکول کا وقت ختم ہو گیا۔ بھاگو یہاں سے !" "نہیں ہم نہیں جائیں گے ۔ اگر آپ کہانی سناتے رہیں گے تو ہم شام تک بیٹھنے کو تیار ہیں۔" چند بچوں نے اونچی آواز میں کہا۔

میں نے انھیں سمجھا بجھا کر بھیج دیا۔ پھر کچھ ٹیچر میرے پاس آ گئے ۔ایک نے کہا: "بھائی صاحب آپ نے تو کمال کر دیا۔ ہمارے درجے کے لڑکے بھی کہانی سننا چاہتے ہیں ۔ وہ کلاس میں پڑھائی پر بالکل دھیان نہیں دیتے ۔مستقل خوشامد کرتے رہتے ہیں کہ انھیں آپ کی کلاس میں جا کر کہانی سننے کی اجازت دی جائے، ورنہ پھر ہم انھیں ایک کہانی سنائیں ! "

"تو پھر سنا دیجئے نا ایک کہانی!" میں نے جواب دیا۔

"لیکن یہاں کہانی سنانا آتا کسے ہے؟ ہمیں تو ایک بھی کہانی ڈھنگ کی یاد نہیں۔"

میں مسکرا دیا۔

V

اگلے دن اتوار تھا۔میں افسر تعلیم سے ملنے چلا گیا۔انھوں نے کہا۔"مسٹر لکشمی رام، ہیڈ ماسٹر کی رپورٹ ہے کہ آپ سارے وقت اپنی کلاس میں کہانی ہی سناتے رہتے ہیں ۔"

"جی ہاں یہ سچ ہے ۔فی الحال کہانی سنانے کا ہی پروگرام ہے —" "لیکن تب آپ اپنا تجربہ کب شروع کریں گے؟ اور کورس کی پڑھائی کیسے پوری ہو گی ؟" وہ بولے ۔

"جناب تجربہ چل رہا ہے۔یہ میرا ذاتی تجربہ ہے اور کہانی ایک ایسی عجیب و غریب جادو کی گولی ہے جو شاگردوں اور اساتذہ کو ایک دوسرے کے قریب لانے اور دوستی میں

مدد دیتی ہے ۔جب سے میں نے کہانی سنانا شروع کی ہے تو وہی لڑکے جنھیں پہلے دن میری بات سننا بھی گوارا نہیں تھا، اور جنھوں نے اپنے شور و غل اور ہنگاموں سے مجھے عاجز کر دیا تھا، بہت خاموش رہنے لگے ہیں ۔اب ان کے دل میں میرے لیے جگہ ہے ۔وہ میری بات سنتے ہیں ۔جیسے کہتا ہوں ویسے ہی بیٹھتے ہیں ۔انھیں خاموش رکھنے کے لیے مجھے ڈانٹنا نہیں پڑتا۔اور اسکول کی گھنٹی بجنے کے بعد بھی وہ گھر نہیں جاتے ۔"

"اچھا ٹھیک ہے ۔میں آپ کی بات سمجھ گیا۔لیکن یہ بتائیے آپ انھیں نئے طریقے سے پڑھانا کب شروع کریں گے ؟"

میں بولا : "جناب سکھانے کا یہی تو نیا طریقہ ہے ۔میں کہانی کی بیٹھکوں کے ذریعے تہذیب و تمیز سکھا رہا ہوں ۔ ان میں جاننے کی خواہش پیدا ہو رہی ہے ۔میں انھیں ادب اور زبان پر قابو پانے کی طرف مائل کر رہا ہوں ۔ اس کے بعد دوسرے مضامین پڑھائے جائیں گے ۔"

افسر تعلیم بولے ۔"لیکن دیکھئے کہیں آپ سارے سال کہانیاں ہی سناتے نہ رہ جائیں !"

VI

کہانی سننے کے لیے سبھی لڑکے ہمیشہ کی طرح چاک سے بنے گولے کے چاروں طرف بیٹھے ہوئے تھے ۔میں نے بلیک بورڈ پر لکھا: آج کا پروگرام (۱) حاضری لینا (۲) بات چیت (۳) کہانی۔

حاضری لینے کے بعد میں نے لڑکوں سے باتیں کرنا شروع کیا۔ "ہاں تو بچو آؤ دیکھیں تمھارے ناخن کیسے ہیں ؟ ایک ایک کر کے سب لوگ کھڑے ہوں اور اپنا ہاتھ میری طرف بڑھائیں تا کہ میں دیکھ سکوں ۔"

ان میں سے ہر ایک کے ناخن کافی بڑھے ہوئے تھے اور ان میں میل بھی جمع

تھا۔ پھر میں نے کہا۔ "اچھا اب اپنی ٹوپیاں اتارو۔" سبھی کی ٹوپیاں میلی چیکٹ اور پھٹی ہوئی تھیں۔ لڑکوں نے اپنی ٹوپیوں کو دیکھا۔

"اچھا اب اپنے کپڑوں کے بٹن دیکھو۔ ٹھیک ٹھاک ہیں نا؟" لڑکوں نے اپنے کپڑوں پر نظر ڈالی۔ صرف چند ہی لڑکوں کے سارے بٹن سلامت تھے۔ "اچھا بس، فی الحال اتنا کافی ہے۔ آؤ اب کہانی سنو، دیر ہو رہی ہے۔" اتنا کہہ کر میں نے کہانی سنانا شروع کر دیا۔ اسی وقت ایک لڑکا کھڑا ہوا اور بولا: ماسٹر صاحب کہانی کی ان کتابوں کا کیا ہوا جو آپ ہمارے لئے لانے والے تھے؟"

میں نے کہا۔ "جن بچوں کو کہانی پڑھنے کا شوق ہے وہ اپنے ہاتھ اوپر اٹھائیں۔" سبھی کے ہاتھ اوپر اٹھ گئے۔

"اچھا اب کہانی کی ان کتابوں کے نام بتاؤ جو تم نے پڑھی ہیں۔" کچھ ہی بچوں نے دو چار کہانیاں پڑھی تھیں حالانکہ چوتھی کلاس میں تھے! لیکن ان میں سے کسی نے بھی نصاب کی کتاب کے علاوہ کوئی باہر کی کتاب دیکھی تک نہ تھی!

میں نے پوچھا۔ "کیا تم لوگ کوئی رسالہ پڑھتے ہو؟"

دو لڑکے بولے: "جی ہاں، ہم 'بال متر' پڑھتے ہیں۔"

میں نے کہا: "اچھی بات ہے۔ ہم کہانی کی کتابیں لائیں گے اور تم پڑھنا۔ ڈھیر ساری کتابیں ہوں گی، جی بھر کے پڑھنا۔" یہ سن کر لڑکے بہت خوش ہوئے۔

میں نے کہانی سنانا پھر شروع کیا۔ سارے دن کہانی چلی۔ یہاں تک کہ اسکول کی گھنٹی بج گئی۔ میں نے لڑکوں سے کہا: "دیکھو جانے سے پہلے ایک بات اور۔ اپنی اپنی جگہ بیٹھ جاؤ اور سنو۔" تب میں نے ان سے اپنے ناخن کٹوا لینے کے لیے کہا۔ "اگر ہو سکے تو خود ہی کاٹ لینا" میں نے کہا۔ "نہیں تو اماں یا ابا کی مدد لے لینا۔ یا پھر تم کسی حجام سے بھی کٹوا سکتے ہو۔"

ایک لڑکا بولا: "میں اپنے ناخن ابھی اپنے دانتوں سے کاٹ ڈالوں گا۔"

"نہیں۔۔ نہیں۔ ناخن کاٹنے کے لیے تو نہرنی یا قینچی استعمال کی جاتی ہے۔"

پھر میں نے پوری کلاس کو مخاطب کرتے ہوئے کہا: "اچھا ایک تفریح ہو جائے۔ لڑکے حیران ہوئے۔ میں بولتا گیا۔۔ "میری رائے ہے کہ تم لوگ ننگے سر اسکول آیا کرو۔ یہ

میلی ٹوپی کس کام کی؟ اور پھر ٹوپی کی ضرورت ہی کیا ہے؟" لڑکے ہنسنے لگے۔ انھوں نے مجھے بتایا کہ ننگے سر اسکول نہیں آیا جا سکتا۔ کہنے لگے: "ہیڈ ماسٹر صاحب ناراض ہوں گے۔"

"اچھا اگر کل میں ننگے سر آؤں تو کیا تم لوگ بھی آؤ گے؟" میں نے پوچھا۔

انھوں نے شبہے کا اظہار کیا۔۔"۔۔۔اور اگر ہمارے ماں باپ اجازت نہ دیں تو؟"

"انھیں سمجھاؤ کہ ٹوپی ایک بیکار سا بوجھ ہے۔ اور پھر اوپر سے یہ ٹوپیاں تو گندی اور پرانی بھی ہیں۔ اور گندی میلی ٹوپی پہننے سے تو کچھ نہ پہننا ہی اچھا۔ کیوں ہے نا؟ ہاں ایک اور بات ہے۔ بٹن ضرور ٹکوا لینا۔ بغیر بٹن کے کپڑے بھدے لگتے ہیں۔"

جب لڑکے گھر گئے تو سب من ہی من میں کچھ سوچ رہے تھے۔ ہیڈ ماسٹر صاحب نے مجھے بلوا بھیجا۔ کہنے لگے۔ "شری لکشمی رام جی آپ مسائل پیدا کر رہے ہیں۔ آخر آپ بے مطلب باتوں میں کیوں لگے ہوئے ہیں؟ ناخن کٹواؤ۔ بٹن ٹکواؤ۔ بہت خوب! آپ پڑھانے کے لیے اپنے نئے طریقوں میں کیوں نہیں لگے رہتے، جس کے لیے آپ یہاں آئے ہیں؟ بٹن ٹانکنا، ناخن کاٹنا، یہ سب تو ماں باپ کا کام ہے نہ کہ اسکول کا۔ ہم اس سب کی فکر کیوں کریں؟ اور خیال رہے۔ لڑکوں کو اسکول میں ننگے سر آنے کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔ یہ بد تہذیبی ہے۔ اور اس کے لیے تو محکمہ تعلیم سے اجازت لینی پڑے گی۔"

میں نے کہا: "جناب۔ واقعی یہی تو نئی سوجھ بوجھ اور تعلیم دینے کے نئے طریقے ہیں۔ جو بچے بے ڈھنگے اور میلے کچیلے ہوں ان کا پہلا سبق اور کیا ہو سکتا ہے، سوائے اس کے کہ انھیں صاف ستھرا رہنے اور ڈھنگ سے کام کرنے کو کہا جائے؟ جب میں نے لڑکوں کی توجہ ان کے میلے کچیلے ہونے کی طرف دلائی تو وہ خود ہی شرمندہ تھے۔ وہ جانتے ہیں کہ اتنا گندہ رہنا ٹھیک نہیں ہے۔ اگر انھیں سکھایا جائے تو مجھے یقین ہے کہ ان میں سے بہت سے صاف ستھرا رہنے کی کوشش کریں گے۔ رہی ٹوپیوں کی بات تو میں یہ معاملہ ایجوکیشن افسر صاحب کے سامنے رکھوں گا۔ اگر ان کی اجازت نہ ملی تو پھر ظاہر ہے تجویز منسوخ ہو جائے گی۔"

اس شام کھانے کے بعد میں ایجوکیشن افسر سے ملنے گیا۔ انھوں نے دیکھتے ہی پوچھا: "کہئے آج اس وقت کیسے آنا ہوا؟"

"جناب میری ایک درخواست ہے آپ سے۔"

"کیسے ؟"

"کیا میں اور لڑکے ننگے سر اسکول جاسکتے ہیں ؟"

"کیوں ۔ آخر کس لئے ؟"

"ان کی ٹوپیاں بڑی میلی اور طرح طرح کی ہیں ۔اس میں برائی کیا ہے اگر وہ بنا ٹوپی کے اسکول آئیں ؟ کیا یہ اچھا نہیں ہو گا کہ اس کم عمری میں ان کے سروں پر یہ بوجھ نہ رہے ۔؟"

افسر بولے : "دیکھئے لوگوں کو یہ بات بڑی عجیب اور مضحکہ خیز معلوم ہو گی ۔ میرا خیال ہے اپنے تجربے کے دوران ہمیں ان کے سماجی طور طریقوں میں دخل نہیں دینا چاہئے ۔ ہمیں صرف یہ پتہ چلانا ہے کہ اسکول کی چہار دیواری کے اندر رہ کر ہم پڑھائی میں کیا سدھار لاسکتے ہیں ۔ بھئی آپ یہ ٹوپی ووپی کا قصہ چھوڑئیے ۔"

مجھے یہ تنگ نظری لگی ۔ساتھ ہی میں نے محسوس کیا کہ اپنی بات پر اصرار کرنے کا کوئی نتیجہ نہیں نکلے گا۔ میں نے سوچا ایجوکیشن افسر اور والدین کو اس مرحلے پر ناراض کرنا ٹھیک نہ ہو گا۔ میں نے اپنی درخواست میں تھوڑی تبدیلی کر دی اور پوچھا۔ "اچھا اگر لڑکے کلاس کے اندر ننگے سر بیٹھ کر کام کریں تو یہ قابل اعتراض تو نہ ہو گا ؟"

"ہر گز نہیں ۔ " انھوں نے جواب دیا۔ " درجے کے اندر آپ جو چاہیں تبدیلیاں کریں ۔ اگر وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ لوگ ننگے سر کے عادی ہو جاتے ہیں تو میں لڑکوں کے ٹوپی پہن کر آنے پر بالکل اصرار نہیں کروں گا۔"

"ایک اور بات ہے جناب ! " میں نے کہا ۔ " میں اپنی کلاس میں ایک لائبریری شروع کرنا چاہتا ہوں ۔ کیا اس کے لیے مجھے مالی امداد مل سکتی ہے ؟"

"اس قسم کا تجربہ ایک طرح سے آپ کے اور میرے بیچ کا معاملہ ہے ۔اسکول کے بجٹ میں جتنے روپئے ہیں اس میں تو پورا اسکول چلانا ہے ۔ آپ کو اپنی ضرورتیں اسی چھوٹی سی رقم میں پوری کرنی ہوں گی جو بجٹ میں سے آپ کی کلاس کے لیے مقرر ہو گی ۔"

"تب میں کیا کروں ؟" میں نے پوچھا۔

"فی الحال اس خیال کو چھوڑ دیجئے ۔"

"میرا ایک اور پلان بھی ہے ۔" میں نے کہا ۔" آپ اجازت دیں تو اس پر عمل

کروں ۔ ہر لڑکے کو نصابی کتابیں خریدنا پڑتی ہیں ۔ زبان سیکھنے کی کتابیں ، ان کتابوں کے نوٹس ۔ تاریخ کی ایک کتاب اور اسی طرح اور بہت سی کتابیں "

"ہاں ۔ تو پھر ؟"

میں بولا " میری رائے ہے کہ لڑکوں سے نصابی کتابیں خریدوائی ہی نہ جائیں ۔ اس کے بجائے ہم ان کتابوں کے دام ان سے اکٹھا کرلیں اور جو رقم جمع ہو اس سے دلچسپ کتابیں منگالیں ۔ اس طرح ایک لائبریری بنانے میں مدد مل جائے گی ۔"

"اور آپ نصابی کتابوں کے بغیر پڑھائیں گے کیسے ؟ انھوں نے پوچھا۔

"جی میں نے اس پر غور کرلیا ہے ۔اس سلسلے میں پڑھائی کے اپنے طریقے پر مجھے پورا بھروسہ ہے ۔ جب میں اس پر عمل کروں گا تو میں آپ کو اس کے بارے میں اچھی طرح یقین دلاسکوں گا۔"

"ہوسکتا ہے ایسا ہی ہو ۔ بھئی تجربہ آپ کا ہے اور اس کے نتیجے کے بھی آپ ہی ذمے دار ہیں لیکن ایک بات سے آگاہ کرنا چاہتا ہوں گا۔ آپ کو یہ یقینی بنانا ہو گا کہ آخر میں کہیں طالب علموں کو نقصان نہ پہونچ جائے ۔اس میں شک نہیں کہ میں آپ کے ساتھ ہوں لیکن نتیجہ کیا نکلے گا اس کے بارے میں مجھے تھوڑا ڈر ہے ۔"

"جناب ۔برائے مہربانی مجھے کوشش کر لینے دیں ۔ خدا نے چاہا تو ہماری کوششوں کا اچھا ہی پھل ملے گا۔"

"ٹھیک ہے ۔لیکن سال ختم ہونے پر آپ اپنی لائبریری کا کریں گے کیا ؟ آپ کتابیں لڑکوں میں بانٹ دیں گے نا ؟"

"جی ہاں ۔ ایک طرح سے یہ کتابیں پوری کلاس کی ہی ہوں گی اور یہ پوری کلاس کو واپس ملنی چاہئیں۔ لیکن میرا خیال ہے کہ میں والدین کو اس بات پر راضی کر سکتا ہوں کہ وہ کتابیں واپس لینے پر اصرار نہ کریں بلکہ انھیں کلاسوں کی لائبریری میں ہی رہنے دیں ۔اس طرح ایک مستقل لائبریری کی بنیاد پڑ جائے گی اور ہر سال اس میں نئی نئی کتابیں بڑھتی رہیں گی ۔"

" کون جانے والدین یہ بات مانیں نہ مانیں ۔بہر حال خیال تو اچھا ہے اس پر عمل کر کے تو دیکھ ہی لیجئے ۔لیکن سچی بات تو یہ ہے کہ ابھی یہ بات میرے ذہن میں صاف نہیں

ہوئی ہے کہ آپ نصابی کتابوں کے بغیر پڑھائیں گے کیسے !"

"جناب ۔اس بارے میں میرے اپنے منصوبے ہیں" ـــــ یہ کہہ کر میں نے اجازت لی اور گھر لوٹ آیا۔

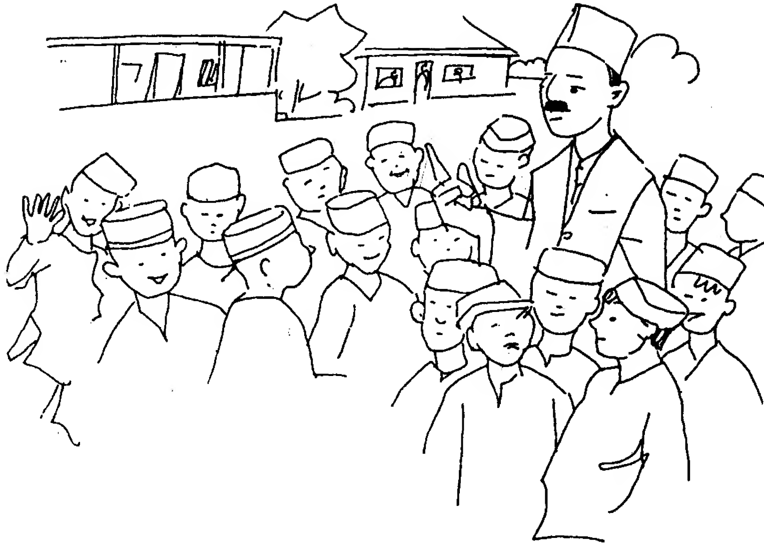
VII

معمول کی طرح دوسرے دن اسکول کھلا۔میں نے سوچا تھا کہ لڑکے شاید ننگے سر آئیں گے لیکن میرا خیال غلط نکلا۔ معلوم ہوا کہ ماں باپ نے ننگے سر اسکول جانے کو منع کردیا تھا ۔انھوں نے کہا۔" کہیں ننگے سر بھی اسکول جاتے ہیں؟ تمہارے ٹیچر تو جھکی معلوم ہوتے ہیں!"

میں نے لڑکوں کے ناخن دیکھے شاید ہی دو چار کے کٹے ہوئے ملے ہوں۔ناخن نہ کاٹے جانے کی وجہ بتاتے ہوئے انھوں نے گھر پر طرح طرح کی مشکلیں بیان کیں اور بٹن ٹانکنے کی فرصت ہی کسے تھی جو ٹانک دیتا ایک ماں نے کہلوایا تھا: "ماسٹر صاحب اگر آپ یہاں پڑھانے آئے ہیں تو مہربانی سے پڑھائیے ۔بس ۔ آپ ان طرح طرح کے جھمیلوں میں کیوں پڑتے ہیں۔ کیا آپ سمجھتے ہیں کہ ہمیں بس ناخن کاٹنے ،بٹن ٹانکنے اور یہ کرنے وہ کرنے کے سوا اور کوئی دوسرا کام ہی نہیں ہے! ہمارے لڑکے تو بس ایسے ہی رہیں گے جیسے ہیں۔ہمیں تو مرنے کی بھی فرصت نہیں۔ آپ کے حکم کی تعمیل ہم کیسے کریں؟"

میں تو حیران رہ گیا! سوچا تھا لڑکے صاف ستھرے آئیں گے ۔اس کے بدلے یہ پیغام ملا! میں نے دل ہی دل میں کہا "چلو ٹھیک ہے ۔پر اس طرح تو میرا کوئی کام نہیں بنے گا۔ مجھے ایک طرف تو والدین کا تعاون حاصل کرنا اور دوسری طرف لڑکوں کے دل میں صفائی ستھرائی کا شوق پیدا کرنا ہوگا۔"

میں نے آگے کوئی بات چیت نہیں کی ۔ کہانی کہنا شروع کردیا ۔ اور پھر کہانی ختم ہو گئی۔



میدان میں کھیل کی تیاری

لڑکوں نے مانگ کی ۔"اب دوسری کہانی سنائیے"۔

"کل سے نئی کہانی شروع کریں گے ۔ آؤ آج تھوڑی دیر کھیل لیں"۔میں نے کہا۔

"کھیلیں؟"لڑکے حیرانی سے بولے۔

"ہاں ہم کھیلیں گے ۔ اچھا تم لوگوں کو کون سے کھیل آتے ہیں؟"

"بہت سارے" انھوں نے جواب دیا۔"لیکن ہم یہاں کھیل کیسے کھیل سکتے ہیں؟"

"کھیل کیوں نہیں سکتے؟"

"یہ اسکول ہے ۔ یہاں کوئی کھیل نہیں کھیلتا ۔ کیا آپ نے یہاں کسی کو کھیلتے دیکھا ہے؟"

"دیکھا تو نہیں لیکن ہم لوگ کھیل سکتے ہیں ۔میں کھیلوں گا تمھارے ساتھ ۔ آؤ چلو کھیلیں"۔

کچھ لڑکے تو وہاں بت کی طرح کھڑے ہی رہ گئے ۔ کچھ خوشی سے چلاتے ہوئے

کھیلنے کے لئے باہر دوڑے ۔جلدی ہی چاروں طرف ایک شور مچ گیا۔ دوسرے درجوں کے لڑکے پیچھے مڑ کر دیکھنے لگے ۔ اساتذہ بھی ہمیں گھور رہے تھے ۔ اتنے میں ہیڈ ماسٹر صاحب بھی دوڑتے ہوئے آگئے اور مجھے یوں نصیحت کی ۔

"دیکھئے آپ دوسرے درجوں کے اتنے قریب نہیں کھیل سکتے۔ اگر کھیلنا چاہتے ہیں تو کھیل کے میدان میں جائیے ۔ یہاں آپ دوسرے درجوں کے لڑکوں کا حرج کر رہے ہیں"۔

میں لڑکوں کو لے کر کھیل کے میدان میں پہونچ گیا۔ لڑکوں نے بے لگام گھوڑوں کی طرح دوڑ لگانا شروع کر دیا۔ وہ چلا رہے تھے ۔"کھیل کھیل ! ہم کھیل کھیلیں گے۔"

میں نے پوچھا۔"کون سا کھیل کھیلو گے ؟"

ایک بولا ۔"کھو کھو۔"

دوسرے نے کہا۔"نہیں کبڈی۔"

تیسرا چلایا۔"ہم لوگ پکڑم پکڑائی کھیلیں گے۔"

چوتھا بولا۔"اگر تم لوگ یہ کھیل کھیلنا طے کروگے تو ہم نہیں کھیلیں گے۔"

"تب ہم تمھارے بنا ہی کھیلیں گے"

"دیکھو بچو"۔میں نے کہا ۔"ہم لوگ تو یہاں کھیلنے آئیں ہیں ۔ اگر تم لوگ لڑائی جھگڑا کروگے تو آؤ پھر واپس کلاس میں چلتے ہیں۔"

یہ سن کر بچے سنبھلے اور بولے "نہیں ہم لوگ تو کھیلنا چاہتے ہیں۔"

"تو پھر آؤ۔ آج ہم لوگ کھو کھو کھیلیں ۔ دو لڑکے کپتان بن جائیں اور اپنی اپنی ٹیم بنالیں۔"

ٹیم چننے میں کافی دیر لگ گئی ۔ ۔بہت سے لڑکے کپتان بننا چاہتے تھے ۔ آخر کار مجھے ہی دو لڑکے چننا پڑے جو کپتان بنے اور انہوں نے اپنی اپنی ٹیم چنی ۔ پھر ہم نے کھیل شروع کر دیا۔

واہ کیا ہنگامی کھیل ہوا ہے ! یہ تو گلی کوچوں میں اودھم مچانے والے بے ہنگم لڑکے کھیل رہے تھے ۔ کھیلتے ہوئے کوئی بھی تو زبان بند نہیں رکھ سکا ۔سب ہی بلا ضرورت چیخ پکار مچائے ہوئے تھے ۔

"ارے آجا لالی پاپ آجا۔ پکڑ مجھے۔"

"ارے بچہ آج تک زندگی میں کبھی کسی کو پکڑا بھی ہے ؟"

"ارے ذرا اس طرف دھیان رکھنا، نکل نہ جائے۔"

"دیکھو کہتا تھا نہ کہ وہ ادھر سے بھاگ جائے گا۔"

"ارے بدھو ہم تیری وجہ سے ہی ہار گئے۔"

اور یہ اسی طرح چلتا رہا۔

میں نے اپنے آپ سے سوال کیا "یہ کھیل کا میدان ہے یا مچھلی بازار ؟ یہ کھو کھو کا کھیل ہے یا چیخ و پکار کا؟"

جب کھیل ختم ہو گیا تو جیتنے والی ٹیم میں سے ایک لڑکے نے ہارنے والی ٹیم کو چڑانا شروع کر دیا۔" واہ واہ ہم لوگ جیت گئے ! کوشش تو بہت کی بچاروں نے پر ہمیں ہرا نہ سکے ۔ کپتان تو اچھا تھا تمھارا مگر ہم نے ناک رگڑوا دی ۔"

مخالف ٹیم کا لڑکا بگڑ کر بولا ۔"ہاں ہم ہار گئے ۔ تو پھر ؟ کیا کر لوگے اب ؟" پہلے لڑکے نے چھیڑ جاری رکھی اور بولا۔" کرنا کیا ہے ۔تم ہار گئے ۔ نکمے ہو تم بالکل ۔ہم لوگوں نے تم لوگوں کو ہرا دیا۔ ہپ ہپ ہرے !"

ہارنے والا غصے سے لال بھبھو کا ہو رہا تھا۔ بولا : "اگر تم نے ایک بھی لفظ اور منھ سے نکالا تو دیکھتے ہو یہ پتھر ؟ سر توڑ دوں گا۔"

پہلا والا لڑکا اپنی بات پر اڑا رہا ۔بولا۔"بچہ جی کبھی ایسا کر بھی سکے ہو تم ؟ میں سو بار کہوں گا کہ ہم نے تم کو ہرا دیا۔ تمھاری کس کے گھسائی کر دی ۔"

اس پر دوسرا آپے سے باہر ہو گیا ۔اس نے ایک پتھر اٹھا کر پہلے لڑکے کی طرف کھینچ مارا جو اس کے سر پر لگا اور سر سے خون بہنے لگا۔

میں ہکا بکا رہ گیا ۔ حالات واقعی بڑے خراب ہو رہے تھے ۔میں نے رومال نکال کر لڑکے کے زخم پر پٹی باندھ دی ۔

میں نے لڑکوں کو آواز دی اور کہا ۔" کل سے ہم لوگ کوئی کھیل نہیں کھیلیں گے ۔"

لڑکوں نے احتجاج کیا:"لیکن ماسٹر صاحب آپ ہم سبھی کو کیوں سزا دے رہے

ہیں جب کہ صرف انھیں دونوں لڑکوں نے جھگڑا کیا ہے۔"

"اچھا اگر تم لوگ میری شرطیں مانوگے تو میں کھیلوں گا۔" میں نے کہا۔

"منظور ہے۔" تمام لڑکے ایک ساتھ چلائے۔

"پہلی بات تو یہ کہ کھیلتے ہوئے کوئی بھی بولے گا نہیں۔ جو بولا وہ کھیل سے نکل جائے گا۔"

"مان لیا۔"

"دوسری بات یہ ہے کہ ہارنے جیتنے کی بات پر کوئی لڑائی جھگڑا نہیں ہوگا۔ اگر ایک ٹیم آج ہار گئی تو دوسری کل ہار سکتی ہے۔ تم ہارے، ہم جیتے کی بات ہی کیوں اٹھے؟ کھیل کا مطلب ہے دوڑنا، بھاگنا اور مزے کرنا۔ کھیل میں اس کی کیا ضرورت کہ ہارنے جیتنے پر ہم لڑیں جھگڑیں اور سر پھوڑیں؟"

"ہمیں منظور ہے۔" سب لڑکے پھر بولے۔

ہم لوگ اسکول واپس آئے۔ زخمی لڑکا ہمارے ساتھ تھا۔ دوسرے درجوں کے لڑکے باہر نکل کر دیکھنے لگے۔ ایک لڑکا ذرا طنزیہ لہجے میں بولا۔ "کیوں کیسا رہا کھیل؟"

دوسرے نے جملہ کسا: "لگتا ہے یہ لوگ ہولی کھیل رہے تھے۔"

جب اسکول کی چھٹی ہوئی تو ٹیچر اور ہیڈ ماسٹر ملے۔ ایک ٹیچر نے مزا لیتے ہوئے پوچھا: "اچھا تو آپ لڑائی کے کھیل کھیل رہے تھے؟" دوسرے نے کہا: "اجی لکشمی رام صاحب کہاں آپ کھیل ویل کے چکر میں پڑ گئے۔ یہ لڑکے تو ہر طرح کے گھروں سے آتے ہیں! انھیں تو بس اسکول کی چار دیواری میں بند رکھنا اور کس کے پڑھانا اور رٹانا چاہئے۔ اگر انھیں آزاد چھوڑ دیا گیا تو یہ ایک دوسرے کا سر پھوڑ ڈالیں گے۔ آپ دیکھتے نہیں کیا۔ گلیوں میں روزانہ کیا ہوتا ہے؟"

اتنے میں ہیڈ ماسٹر صاحب بولے: "میں جانتا تھا کہ کوئی نہ کوئی حادثہ ضرور ہوگا۔ ٹھیک ہے ان صاحب کو سبق ملنا ہی چاہئے ورنہ یہ نچلے نہیں بیٹھیں گے۔ کھیل! اور وہ بھی اسکول میں؟ بکواس!"

"جناب" میں نے جواب دیا، "کھیل ہی تو سچی پڑھائی ہے۔ دنیا کی بڑی بڑی ہستیاں کھیل کے میدان پر ہی پیدا ہوئی ہیں۔ کھیل کا مطلب ہے کردار کی تشکیل۔"

"اچھا اسی لئے یہ جھگڑا ہوا اور ایک لڑکے کا سر پھوٹا! کیوں؟" ہیڈ ماسٹر صاحب نے پٹ سے جواب دیا۔

ہماری بات چیت جاری ہی تھی کہ جس لڑکے کے سر میں چوٹ لگی تھی اس کے باپ آگئے۔ وہ بے حد غصہ میں تھے گرج کر بولے: "میں اس طرح کی تعلیم نہیں چاہتا۔ دیکھئے اس کا سر پھٹ گیا۔ کہاں ہیں ہیڈ ماسٹر؟ کس نے میرے بیٹے کو پیٹا ہے؟"

میں نے کہا: "جناب لڑکے باہر کھیلنے گئے تھے۔ وہاں کچھ جھگڑا ہوگیا اور اسے چوٹ آگئی۔" باپ نے پوچھا، "لیکن اس سے باہر جانے اور کھیلنے کو کس نے کہا تھا؟ اسکول پڑھائی کے لئے ہوتے ہیں یا کھیل کے لیے؟ سارے دن لڑکے گلیوں اور سڑکوں پر کھیلتے ہی تو رہتے ہیں۔ اگر آپ پڑھائی کرائیں گے تب ہی میں اپنے لڑکے کو اسکول بھیجوں گا ورنہ نہیں۔"

میں کچھ نہ کہہ سکا۔ ہیڈ ماسٹر صاحب بیچ میں بول اٹھے:

"جناب یہ ماسٹر نئے نئے آئے ہیں اور پڑھائی کے کچھ تجربے کر رہے ہیں۔ آج لڑکوں کو کھیل کے لئے لے گئے اور وہاں آپس میں لڑائی ہو گئی۔"

"مجھے آپ کے ان تجربوں کی ضرورت نہیں ہے۔ اگر ہو سکے تو قاعدے سے پڑھائیے ورنہ میں اسے اسکول سے اٹھالوں گا۔"

دوسرے ٹیچر دل ہی دل میں ہنس رہے تھے۔ میں بول بھی کیا سکتا تھا۔

میں گھر پہونچا۔ کچھ نہیں کیا۔ سیدھا اپنے کمرے میں جا کر لیٹ گیا اور سوچنے لگا کتنی شرم کی بات ہے! خیر کوئی بات نہیں۔ میں نے کھیل کے کچھ قاعدے تو بنا لئے ہیں کچھ اور قاعدے جوڑ دوں گا۔ لیکن کھیل ضرور کھیلے جانے چاہئیں۔ میرے خیال میں یہ اصلی تعلیم ہے۔ اچانک میرے ذہن میں ایک خیال آیا کیوں نہ والدین کی ایک میٹنگ بلائی جائے اور انھیں بتایا جائے کہ بچوں کے لیے کھیل کی اہمیت کیا ہے۔ مجھے طور طریقے اور صفائی ستھرائی کے بارے میں ان کی مدد حاصل کرنی چاہئے۔ اگر انھوں نے ساتھ نہ دیا تو میں کچھ بھی حاصل نہ کر سکوں گا۔ وہ لوگ اپنے بچوں کی خاطر اتنی تکلیف تو اٹھا ہی لیں گے کہ میٹنگ میں آجائیں۔ ہم ٹیچر لوگ اسی میں تو ناکام رہتے ہیں کہ ماں باپ کا تعاون حاصل نہیں کرتے۔ کل مجھے والدین کی میٹنگ ضرور بلانی چاہئے۔

VIII

ماں باپ کے ساتھ میٹنگ تو ہوئی لیکن اسے میٹنگ کہا بھی جاسکتا ہے یا نہیں؟

میں نے چالیس لوگوں کو بلاوا بھیجا تھا لیکن صرف سات صاحبان تشریف لائے۔ مجھے سخت مایوسی ہوئی۔ میں نے پہلے سے ایک تقریر اچھی طرح تیار کر رکھی تھی، سو بولنا شروع کر دیا۔ سوچا ہمارا کام تو کوشش کرتے رہنا ہے، اور یہ تقریر بھی اسی مقصد سے ایک تجربہ تھی۔

میں نے بڑی سنجیدگی سے تقریباً ایک گھنٹے تک تقریر کی جو یقیناً سوچنے پر مجبور کرتی تھی۔ سات آدمیوں میں سے ایک کے گھر سے بلاوا آگیا اور وہ اٹھ کر چلے گئے۔ باقی میری بات سن تو رہے تھے لیکن صاف معلوم ہو رہا تھا کہ جیسے بیزار ہیں۔ لیکن میرے لیے تو میری ساری باتیں بڑی اہم تھیں اور انھیں اچھی طرح سمجھانا تھا۔

میں نے بڑی تفصیل سے سمجھایا کہ تعلیم میں کیا صحیح ہے اور کیا غلط۔ میں نے سمجھایا کہ روحانی پاکیزگی کے بعد جسم کی صفائی کا ہی نمبر آتا ہے۔ میں نے یہ بھی بتایا کہ کس طرح کھیل کردار کو مضبوط بناتا ہے۔ میں نے انھیں اپنے اندر نظم و ضبط (ڈسپلن) پیدا کرنے کی اہمیت سمجھائی۔ میں نے اسکولوں میں موجودہ تعلیمی نظام اور وہاں کے قاعدے قانون کی نکتہ چینی بھی کی۔

لیکن ساری محنت اکارت گئی اور وقت الگ برباد ہوا۔ چند لوگ جو شرماحضوری میں آگئے تھے، وہ بھی جانے کی فکر میں تھے اور جوں ہی میری تقریر ختم ہوئی جلدی سے اٹھ کر چلے گئے۔ بس ہم اساتذہ اور افسر تعلیم ہی باقی بچے۔ افسر تعلیم نے مسکرا کر کہا: "لکشمی رام صاحب۔ آپ کی کوشش تو بے کار ہی گئی۔ آپ کے فلسفے کو سمجھے گا کون؟"

میرے پیچھے سے ایک ٹیچر نے آہستہ سے کہا: "ہوائی بات اڑانے والا احمق!"

مجھے بڑی کوفت ہوئی مگر کچھ بولا نہیں۔ مجھے یقین ہو گیا کہ آخر کار میں ہوائی

باتیں کرنے والا ہی نکلا اور مجھے بالکل نہیں معلوم کہ سیدھے سادے لوگوں کے سامنے کس طرح کی تقریر کی جاتی ہے۔

تمام ٹیچر ہنستے ہوئے گھروں کو لوٹ گئے۔

IX

کوئی آٹھ دس روز کے بعد میں نے لائبریری بنانے کے پراجیکٹ پر کام شروع کیا۔ میں لڑکوں کو بہت سی کہانیاں سنا چکا تھا۔ وہ چوتھے درجے میں تھے۔ اب وقت آگیا تھا کہ ان کے پاس پڑھنے کو کتابیں ہوں۔

میں نے لڑکوں سے کہا: "دیکھو تم لوگ کل مادری زبان کی کتاب اور تاریخ کی کتاب خریدنے کے لیے پیسے لے آنا۔ ہم یہاں ہی سب انتظام کر لیں گے۔"

لیکن دوسرے دن ایک لڑکا دونوں کتابیں لے کر آیا اور بولا: "میرے ابا یہ کتابیں اسی دن خرید لائے تھے جب ہمارا نتیجہ سنایا گیا تھا۔"

دوسرے لڑکے نے کہا: "میں بھی کتابیں لایا ہوں۔ یہ میرے بھائی کی ہیں۔"

تیسرے لڑکے نے کہا: "میں یہاں کتابیں نہیں خریدوں گا۔ میرے چچا یہ کتابیں مجھے بمبئی سے بھیجنے والے ہیں۔"

ایک اور بولا: "جی میرے ابا مجھے پیسے نہیں دیتے۔ کہتے ہیں کہ وہ میرے لیے کتابیں خود خریدیں گے۔"

"مارے گئے۔" میں نے سوچا۔ "خیالوں میں ایک لائبریری بنا لینا کافی آسان تھا مگر سچ مچ ایسا کرنا اس کا الٹا ہی ہے۔"

کچھ لڑکے کتابوں کے لئے روپئے لائے تھے۔ میں نے ان سے روپئے لے کر انھیں رسید دے دی۔ اگلے دن ان لڑکوں نے آتے ہی اپنی نصابی کتابیں مانگیں۔

میں بولا: "دیکھو تم لوگوں سے جو رقم اکٹھا ہوئی تھی ان سے میں تمھارے لیے



پندرہ لڑکوں نے پندرہ کتابیں اٹھالیں اوران پر شیر کی طرح ٹوٹ پڑے۔

کہانی کی کتابیں لایاہوں ۔ تم نے کہا تھا کہ کہانیاں پڑھنا پسند کروگے تو میں نے کہانی کی کتابیں خریدلی ہیں ۔" لڑکے رنگ برنگی اورجلدوں والی کتابیں دیکھ کر خوش ہوگئے اور کتابوں کے لیے چھینا جھپٹی شروع ہو گئی۔

مئیں نے کہا : "دیکھو ، ابھی ہمارے پاس صرف پندرہ کتابیں ہیں اور پندرہ لڑکے پڑھ سکیں گے ۔ باقی بیس (20) لڑکے میرے پاس آئیں اور سنیں کہ میں کیا پڑھ رہاہوں ۔"

گڑبڑ سے بچنے کے لیے میں نے پھر کہا: "قطار میں آکر پندرہ لڑکے کتابیں اٹھائیں گے ۔بقیہ میرے پاس آئیں گے ۔"

قطار میں آکر پندرہ لڑکوں نے کتابیں اٹھائیں اور پڑھنے لگے ۔ میں نے کہا: "جیسے ہی ایک لڑکا اپنی کتاب پڑھنا ختم کرلے، وہ کتاب لاکر میری میز پر رکھ دے اور وہاں پہلے سے واپس رکھی گئی دوسری کتاب اٹھالے ۔اس طرح سبھی لڑکے باری باری یہ تمام کتابیں پڑھ سکیں گے ۔"

میں نے بقیہ لڑکوں کو اپنے پاس بلالیا اور کہانی کی ایک کتاب اٹھا کر انھیں صحیح طریقے سے پڑھنا سکھانے کے لیے خود درست لہجے اور آواز سے پڑھنے لگا۔ لیکن افوہ، ان پندرہ لڑکوں کے ایک ساتھ زور زور سے پڑھنے کی وجہ سے ایسا شور مچا کہ نہ پوچھئے ۔ میں رک گیا اور ان سے کہا: "ارے لڑکو ذرا آہستہ پڑھو بھائی ۔ہم لوگ تمھارے اس قدر زور زور سے پڑھنے کی وجہ سے کچھ نہیں کر پارہے ہیں ۔"

لڑکوں نے اپنی آواز دھیمی کردی لیکن انھوں نے خاموشی سے من ہی من میں پڑھنا سیکھا ہی نہیں تھا ۔ وہ صرف اونچی آواز سے پڑھنا جانتے تھے ۔ تھوڑی دیر تو ان کی آواز دھیمی رہی لیکن پھر انھوں نے زور زور سے پڑھنا شروع کردیا۔ میں نے ان سے برآمدے میں جا کر ذرا پھیل کر بیٹھنے کو کہا اور خود درجے میں ہی بیٹھا رہا۔

میری مثالی پڑھائی چلتی رہی ۔ کہانی خاص طور پر چنی گئی تھی ۔ سبھی لڑکے دلچسپی سے سن رہے تھے ۔ دوسرے لڑکوں کی پڑھائی بھی جاری رہی ، یہاں تک کہ اسکول کی چھٹی کی گھنٹی بج گئی اور ہم سب اپنے اپنے گھر چلے گئے۔

X

کہانی کھیل کود، لائبریری، مثالی پڑھائی، لڑکوں کی جسمانی صفائی ستھرائی اور اچھے طور طریقے اپنانے کی طرف ان کا دھیان دلانے میں میرے کوئی دو مہینے نکل چکے تھے ۔ میں نے اپنے کام کا جائزہ لیا جو کام ہو چکا تھا اس پر نظر ڈالی تو مجھے لگا ابھی تو بس پہلے چند قدم ہی اٹھائے گئے ہیں ۔ زبان ، حساب ، تاریخ ، اور سائنس وغیرہ سکھانے کے سلسلے میں تو کچھ ہوا ہی نہیں تھا ۔ دوسرے درجوں میں کچھ سبق پورے بھی ہو چکے تھے ۔ سال کے ختم ہونے تک مجھے سب کچھ پورا کر دکھانا تھا ۔ میرے اس تجربے کی شرط بھی یہی تھی ۔ "اب یہ دیکھا جائے کہ میں نے اب تک حاصل کیا کیا ہے ۔" میں نے دل میں سوچا ۔ کہانی سنانے کا کام تو بڑا اچھا چل رہا ہے اور اس سے ایک حد تک لڑکوں میں شوق اور کچھ ڈسپلن بھی پیدا ہو گیا

ہے ۔ پھر بھی چمپک لال اور رمن لال کو کہانیاں پسند نہیں ۔ رام جی اور شنکر کو وہ بڑی آسان لگتی ہیں ۔ رگھو اور مدھو پورے وقت ایک دوسرے کو آنکھیں مارتے ہیں اور اشارے کرتے رہتے ہیں ۔ یہ دونوں بالکل دھیان نہیں دیتے اور بڑے شریر ہیں ۔ اس بارے میں کچھ کرنا پڑے گا ۔ رہا کھیل تو یہ سچ ہے کہ کھیلنے کی وجہ سے لڑکے مجھ سے قریب ہو گئے ہیں، کھل کر باتیں کرنے لگے ہیں اور مجھے اپنا سمجھتے ہیں ۔ اب وہ مجھ سے پہلے کی طرح ڈرتے نہیں اور کھیل کے بعد مثالی پڑھائی کو بڑے دھیان سے سنتے ہیں لیکن کھیل کے بیچ شور اور ہنگامہ کرنے میں ابھی بہت کمی نہیں آئی ہے ۔ میں اس سلسلے میں بڑی کوشش کر رہا ہوں لیکن ابھی ایک لمبا راستہ طے کرنا ہے !

لائبریری میں ابھی تھوڑی ہی سی کتابیں ہیں ۔ میں والدین کو سمجھا نہیں پایا ہوں کہ نصابی کتابوں کی بجائے ایک لائبریری ہونی چاہئے ۔ مجھے اس بات کا یقین تھا کہ اگر لڑکوں کے ماں باپ سے بات چیت کر کے تھوڑی وضاحت کر دی جائے گی تو یہ کافی ہو گا لیکن یہاں ماں باپ بس ایک ہی بات جانتے ہیں کہتے ہیں : "لڑکوں کو پڑھاؤ ۔" ان کے پاس کچھ اور سننے کا نہ تو وقت ہے اور نہ ہی وہ بات سمجھتے ہیں ۔ خیر کوئی بات نہیں ۔ اگر میں اسی طرح جما رہا تو بات بن جائے گی آج نہیں تو کل ! ۔ ابھی میرے پاس کافی وقت ہے ۔ یہ تجربہ واقعی کوئی آسان کام نہیں ہے ! جتنا ہمارا تخیل وسیع ہوتا ہے، ہماری سمجھ بوجھ بڑھتی ہے، اتنا ہی ہمارے آدرش اونچے ہوتے جاتے ہیں اور کام کی سنجیدگی اور پیچیدگی بڑھتی ہے ۔ مجھے کئی سوال ستا رہے تھے ۔ جسمانی صفائی کے سلسلے میں ابھی کچھ ایسا ہوا ہی نہیں تھا جو قابل ذکر ہو ۔ میں ٹوپیوں کے بارے میں کچھ نہ کر سکا تھا اور وہ ویسی ہی تھیں ۔ کپڑے شروع شروع میں ایک دو روز صاف نظر آئے مگر پھر اسی پرانی ڈگر پر واپس ۔ لڑکوں کے ناخن بھی ہمیشہ کی طرح ویسے ہی بڑھے ہوئے تھے ۔ مجھے ان کاموں کے پیچھے پڑنا ہی

ہو گا ۔ کوئی اور راستہ نہیں ہے ۔ چونکہ سماج میں نئی عادتیں ڈالنی ہیں اس لیے بار بار کوشش کرنا پڑے گی ۔

اور مجھے اکیلے لڑکوں ہی کی فکر تو ہے نہیں ۔ ایجوکیشن افسر بھی اب کچھ بے چین ہو رہے ہیں ۔ ان کے اپنے مسائل ہیں ۔ ان کے بھی تو افسر اور مخالفین ہوں گے ۔ ایجوکیشن افسر کامیابی میں حصہ دار بننا چاہتے ہیں اور اسی لیے فکر ہے کہ تجربے کا نتیجہ اچھا رہے، لیکن نتیجے کی انھیں جلدی بہت ہے ! جہاں تک میری مدد کا سوال ہے ان کی اپنی مجبوریاں ہیں ۔

میرے ساتھی ٹیچروں کو مجھ پر بالکل بھروسہ نہیں ہے ۔ وہ مجھے ایک خواب پسند آدمی سمجھتے ہیں ۔ شائد ایسا ہی ہو ۔ اس کے علاوہ میں نا تجربہ کار بھی تو ہوں ۔ لیکن مجھے پڑھانے کے سلسلے میں ان کے خیالات اور طریقوں پر بالکل بھروسہ نہیں ہے ۔ ان سے تو مجھے چڑھ ہوتی ہے ۔ مجھے یقین ہے کہ میرا طریقہ لاکھ درجے اچھا ہے ۔ میرے لڑکے مجھ سے بھاگتے تو نہیں ۔ وہ مجھ سے پیار کرنے لگے ہیں ۔ میری عزت کرتے ہیں اور میری بات مانتے ہیں جب کہ دوسرے درجوں کے لڑکے اپنے ٹیچروں سے بھاگتے ہیں ۔ میں نے خود انھیں ٹیچروں کے پیٹھ پیچھے ان کی نقلیں اتارتے دیکھا ہے ۔ ایک بھی لڑکا ایسا نہیں جو ٹیچر کے پاس مسکراتا ہوا جائے اور محبت سے بات کرے ۔ وہ اپنی کلاسوں میں تو بڑے چپ چاپ منہ لٹکائے اور بنا ہلے ڈلے بیٹھتے ہیں پھر جونہی باہر نکلتے ہیں تو اس قدر اودھم مچاتے اور لڑتے جھگڑتے ہیں کہ پوچھئے مت ۔ اس سلسلے میں، اپنی کلاس کے لڑکوں کو، میں نے کافی آزادی دے رکھی ہے ۔ درجے میں ہی تھوڑی بہت گڑبڑ مچا کر ان کی بے چینی دور ہو جاتی ہے اسی لیے باہر جا کر وہ زیادہ ہنگامہ نہیں کرتے ۔

دوسرے ٹیچر کہتے ہیں کہ میں نے کچھ زیادہ ہی ڈھیل دے رکھی ہے اور لڑکوں

کو برباد کر رہا ہوں ۔ انھیں شکایت ہے کہ میں صرف کہانیاں سناتا رہتا ہوں اور پڑھاتا لکھاتا نہیں ۔ اور یہ بھی کہ انھیں کھیل کے لیے باہر لے جا کر کلاسوں کا ناغہ بھی کرتا ہوں ۔ ٹھیک ہے ۔ دیکھا جائے گا ۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ کہانیوں اور کھیل سے ہی ان کی آدھی تعلیم ہو جاتی ہے ۔

مجھے یہ بات ذہن نشین کر لینی چاہیئے کہ میرا کام آگے چل کر بڑا کٹھن ہو جائے گا اور مجھے یہ بھولنا نہیں چاہیئے کہ مجھے کیا کرنا ہے ۔

آدھی رات کو بارہ بجے گھڑیال کی آواز نے مجھے چونکا دیا اور خیالوں کا سلسلہ ٹوٹا۔ میں نے دل ہی دل میں کہا : "سب کچھ خدا کے ہاتھ میں ہی ہوتا ہے ۔ بہتر ہے اسی پر چھوڑ دیا جائے ۔ کل کی کل دیکھی جائے گی۔"

یہ کہہ کر میں سو گیا۔

دوسرا حصہ

تجربے میں ترقی

I

تیسرا مہینہ شروع ہو گیا تھا۔ میں نے سوچا اب روزانہ کے کام کی ڈائری رکھنا شروع کروں تاکہ معلوم ہو سکے کہ ایک ہفتے میں کتنا کام ہو گیا۔ میں نے ایک مہینے کے کام کا خاکہ تیار کیا۔ میری ڈائری کوئی تفصیلی رجسٹر (Logbook) نہیں ہو گی ۔ یہ ایک طرح کی یادداشت ہو گی جس سے کام میں ہوئی ترقی کا اندازہ ہو سکے ۔

کہانی تو روزانہ کے کام کا ایک حصہ تھی۔ کھیل بھی روز ہی کھیلے جاتے تھے ۔ اس درمیان میں، آپس کی بات چیت، مثالی پڑھائی اور جسمانی صفائی ستھرائی کی جانچ کا کام بھی ہوتا رہتا تھا۔ لائبریری بھی بن رہی تھی لیکن دھیمی رفتار سے ۔

II

اب میں نے مقرر کئے ہوئے نصاب میں سے کچھ کام کرانے کی سوچی ۔ ایک صبح میں نے لڑکوں سے کہا : "چلو ڈکٹیشن لکھو ۔" وہ بھونچکے ہو کر مجھے دیکھنے لگے ۔ انھوں نے سوچا بھی نہ تھا کہ میں کبھی املا لکھواؤں گا یا نصاب کی کتاب سے سبق پڑھاؤں گا یا انھیں نقشہ دیکھنے کی مشق کراؤں گا ۔ انھوں نے مجھے اس طرح کا ٹیچر سمجھا ہی نہیں تھا۔ ایک طرح سے وہ ایسا سوچنے میں ٹھیک ہی تھے کیونکہ میں یقیناً اس قسم کا ٹیچر تھا بھی نہیں ۔

"لکھو ۔" میں نے کہا۔

بہت سے لڑکوں کے پاس نہ سلیٹ تھی نہ پنسل ۔ اب تک میری کلاس میں ان

چیزوں کی ضرورت ہی نہیں پڑی تھی ۔ اس لیے وہ لے کر ہی نہیں آئے تھے ۔میں نے پاس کے ایک درجے سے سلیٹیں اور پنسلیں انھیں لا کر دیں اور ڈکٹیشن دینے چلا۔

کچھ لڑکوں نے اس پر اپنی ناپسندیدگی ظاہر کی ۔ ایک بولا: "جناب کیا آج کہانی نہیں ہوگی ؟" دوسرے نے کہا : " ہم کلاس میں زبان سیکھنے کی کتاب تو پڑھتے نہیں ۔ پھر آپ ہمیں ڈکٹیشن دیں گے کہاں سے ؟" کئی آوازیں آئیں ۔ "مہربانی سے پہلے ہمیں وہ حصہ پڑھ لینے دیجئے جس کی ڈکٹیشن دیں گے تاکہ غلطیاں نہ ہوں ۔"

"ارے یہ سب تو اسی پرانے ڈھرے کے عادی ہیں ۔ ڈکٹیشن کا پرانا ہی مطلب وہ جانتے ہیں اس لیے اسے پسند نہیں کرتے ۔ وہ اس سے ڈرتے ہیں اور اسی وجہ سے پہلے تیاری کر لینا چاہتے ہیں ۔ "میں نے سوچا۔

میں نے لائبریری کی ایک کتاب اٹھائی اور ڈکٹیشن دینے لگا ۔میں نے چند ہی لفظ بولے تھے کہ لڑکے لکھنے لگے ۔ انھوں نے پورے جملے کی طرف کوئی دھیان نہیں دیا۔ پھر وہ مجھ سے جملہ دوہرانے کے لیے کہنے لگے ۔ جملہ دوہرانے کی باربار درخواستیں ہوئیں ۔

"دیکھو !"میں نے کہا ۔ " میں تمھیں ڈکٹیشن لینا سکھاؤں گا۔ جب میں بول رہا ہوں تو تم لوگ میری طرف دیکھو ، مجھے توجہ سے سنو ، سمجھو کہ میں کیا کہہ رہا ہوں اور تب لکھو اس کے بعد میری طرف دوسری جملے کے لیے پھر دیکھنا ۔"

میں نے ڈکٹیشن جاری رکھی ۔ شروع میں تو لڑکے اپنی پرانی عادت نہیں چھوڑ پائے لیکن کچھ دیر بعد، انھوں نے اس طریقے سے ڈکٹیشن لینا سیکھ لیا جو طریقہ میں نے بتایا تھا۔ پھر کسی کو بھی میری کہی ہوئی بات باربار دوہرانے کو نہیں کہنا پڑا۔ میں صرف ایک بار بولتا اور وہ لکھ لیتے ۔میں نے ایک لفظ بھی نہیں دوہرایا۔

ڈکٹیشن ختم ہوئی ۔ لڑکوں نے اپنے اپنے سلیٹ رکھ دیئے اور میں ان کا کام جانچنے لگا۔ مجھے بچے کی بہت غلطیاں نظر آئیں۔ بہتوں کو حرف جوڑنے نہیں آتے تھے اور ان کی لکھائی بھی اچھی نہیں تھی۔

میں نے ان کی سلیٹوں پر غلطیاں ٹھیک نہیں کیں ۔ کام دیکھ کر سلیٹ انھیں واپس کر دیئے ۔لڑکے چلا چلا کر بولنے لگے ۔ کچھ لڑکوں نے پوچھا : "میں نے کتنی غلطیاں کی ہیں " دوسروں نے چاہا کہ میں بتاؤں ان میں کون اوپر ہے اور کون نیچے ۔

ایک لڑکا بولا : "اب لکشمی رام بھائی بھی ہمیں دوسرے ٹیچروں کی طرح پڑھایا کریں گے اور پھر نمبر دیا کریں گے ۔"

"میں تو ایسا کچھ بھی نہیں کروں گا ۔" میں نے کہا ۔ " تم سب لوگ خوب جانتے ہو کہ کس طرح اچھا لکھا جاتا ہے ۔ کل پھر کوشش کرنا۔ آہستہ آہستہ اچھا لکھنا سیکھ جاؤگے ۔ مشق کرنے سے اچھا لکھنے میں مدد ملے گی ۔ مجھے پکا یقین ہے اس کا اور پھر تمھاری غلطیاں نکال کر کرنا بھی کیا ہے ؟"

ایک لڑکے نے پوچھا : "لیکن اول دوم والی بات کا کیا ہوگا؟"

"جب میں تمھیں کہانی سناتا ہوں تو کیا نمبر دیتا ہوں؟"

"جی نہیں ۔"

جب ہم کھیلتے ہیں تو کیا اول دوم بتایا جاتا ہے ؟"

"جی نہیں"

"تم میں سے کچھ لڑکے لمبے اور کچھ ٹھگنے ہیں تو کیا اس کے لیے تمھیں اول دوم کیا جاتا ہے ؟"

"جی نہیں ۔"

"تم میں سے کوئی موٹا ہے تو کوئی دبلا ہے ۔ کیا اس میں اول دوم ہوتا ہے ؟"

"بالکل نہیں ۔"

"تم میں سے کوئی امیر ہے اور کوئی غریب ۔ کیا اسکول اس بات کے لیے کہ تم امیر ہو یا غریب نمبر دیتا ہے یا اول یا دوم قرار دیتا ہے ؟"

"جی نہیں"

"تو بس سمجھ لو ، ہمیں اول یا دوم بتانے کے طریقے کی بالکل کوئی ضرورت نہیں ہے اگر کوئی گانا جانتا ہے تو نظمیں گائے ۔جب اسے کچھ بھولے تو وہ اسے یاد کرنے کی کوشش کرے ۔ اگر کوئی کسی کھیل کو نہیں جانتا تو وہ دوسروں کو کھیلتے دیکھے اور سیکھ لے اور جو کسی کھیل میں اچھا ہو ، وہ خوشی حاصل کرنے کے لیے اسے کھیلے ۔ایک بچہ جس کی لکھائی خوبصورت ہو وہ ان کے لیے ماڈل (نمونہ) بن سکتا ہے جو اپنی لکھائی بہتر بنانا چاہتے ہیں۔ اگر کوئی آدمی اچھا کام کرتا ہے تو وہ ان لوگوں کو جو اس کام کو اچھا نہیں کر پاتے

ہمیشہ سکھا سکتا ہے ۔ بس اتنی سی بات ہے !"

لڑکے حیران ہو کر مجھے دیکھ رہے تھے ۔

آخر میں میں نے کہا: "ہماری کلاس ایک مختلف قسم کی اور بالکل ہی نئی چیز ہے ۔ ہم ایک نیا راستہ روشن کر رہے ہیں ۔ یہ ہماری کلاس ہے ۔" میں نے ہماری کلاس زور دے کر کہا اور یہ الفاظ کئی بار دوہرائے ۔

لڑکے سمجھ گئے اور انھوں نے کہا: "ہماری کلاس - یہ ایک انوکھی چیز ہے اور بالکل نئی بھی ۔"

ایک ہفتے کے اندر ہی اندر ڈکٹیشن کے کام میں کچھ بہتری آ گئی ۔ میں ہر روز انھیں کتاب سے نقل کرنے کا کام بھی گھر پر کرنے کو دینے لگا ۔ انھیں ایک کتاب سے چار سطریں نقل کرنی پڑتی تھیں ۔ میں روزانہ انھیں دس منٹ ڈکٹیشن بھی بولتا ۔ لڑکوں سے ایک دوسرے کو آپس میں بھی ڈکٹیشن بولنے کو کہا گیا ۔ وہ ایک دوسرے کا کام بھی جانچتے ۔

میں نے چوتھے درجے کی مادری زبان کی کتاب سے جڑنے والے مشکل حروف کی ایک فہرست بنائی اور بچوں کو ایک ایک کر کے دی کہ اسے نقل کر لیں ۔ ہجے کی مشق کرانے کے لیے بھی میں نے کتاب کے مشکل الفاظ کی ایک فہرست تیار کی ۔

ہمارا کام اچھی طرح آگے بڑھ رہا تھا ۔

III

ایک دن جب لڑکے کہانی سن رہے تھے ، پاس کے درجے سے کسی کے رونے کی آواز سنائی دی ۔ ہم سب گھبرا گئے ۔ بچوں کا کہانی کی طرف دھیان دینا مشکل ہو رہا تھا ۔ میں نے کہانی سنانا بند کر دیا اور کہا کہ کوئی لڑکا جا کر دیکھے کہ کون رو رہا تھا اور بات کیا تھی ۔ ذرا بڑی عمر کا ایک لڑکا باہر گیا اور ایک منٹ میں ہی واپس آ گیا اور کہنے لگا: "ٹیچر نے جیوا کی پٹائی کی ہے ۔"

"کیوں ؟" میں نے پوچھا ۔

"اسے جغرافیہ کا سبق یاد نہیں تھا ۔"

"تو اس کی پٹائی کیوں ہوئی ؟"

"اگر وہ سبق یاد کر کے نہیں آتا تو اسے نتیجہ بھگتنا ہی پڑے گا ۔" ایک لڑکا بولا ۔

"لیکن فرض کرو اسے آتا ہی نہ ہو ۔"

"آنا تو چاہیئے ۔ نہیں آئے گا تو ماسٹر ضرور ماریں گے ۔"

"لیکن اگر کوشش کرنے پر بھی کسی کو یاد نہ ہوتا ہو تب ؟"

تیسرے لڑکے نے کہا : "تو بھی ماسٹر ضرور ہی ماریں گے ۔ اگر کسی کو نہیں آتا تو اس کی پٹائی ہوتی ہے ۔"

"اچھا کیا تم میں سے کوئی مار کھانا چاہتا ہے ؟"

"جی نہیں ۔ بھلا کون پٹنا چاہے گا ؟"

"اچھا فرض کرو میں تمھیں چند سبق یاد کرنے کو دوں اور تم نہ یاد کرو تو کیا میں تمھاری پٹائی کروں ؟"

"لیکن ہم تو آپ کے دیئے ہوئے سبق یاد کر لیں گے ۔"

"مان لو تم یاد کرنے کی کوشش کے باوجود بھی یاد نہ کر سکو تو ؟"

"نہیں آپ کو کسی بھی حالت میں ہمیں مارنا نہیں چاہیئے ۔ اس سے تکلیف ہوتی ہے ۔ اگر ہمیں نہ آتا ہو تو پھر سے پڑھا دیجیئے ہم اور بھی زیادہ محنت سے کام کریں گے ۔"

"اچھا ٹھیک ہے ۔" میں نے کہا ۔ "چلو کہانی جاری رکھتے ہیں ۔"

"سناؤ نا ؟"

میں نے پھر کہانی کہنا شروع کر دیا لیکن لڑکوں کا دھیان تو جیوا میں لگا ہوا تھا ۔ بولے : "جناب جیوا ایسا لڑکا ہے جو ٹیچروں کے پیٹھ پیچھے انھیں گالیاں دیتا ہے ، دیواروں پر ان کے کارٹون بناتا ہے اور گندے گندے نام لکھتا ہے ۔"

"جیوا کو ایسا نہیں کرنا چاہیئے ۔"

"لیکن ٹیچر بھی تو اس کی کس کے پٹائی کرتے ہیں ۔" لڑکے بولے ۔

"تو پھر کیا کرنا چاہیئے ؟" میں نے سوال کیا ۔

"ٹیچر کو اسے مارنا نہیں چاہئے۔"

"پھر سبق کا کیا ہوگا؟"

لڑکے بولے "اگر کوئی سبق یاد نہ کرے تو اسے اسکول سے نکال دینا چاہئے۔ اس کی پٹائی کیوں کی جائے؟ اگر پٹائی کرنے سے سبق یاد ہوتا ہے تو پھر روز ہی ہر لڑکے کی پٹائی کی جانی چاہئے!"

ایک لڑکے نے کہا: "جیوا کو پڑھنے کا شوق ہی نہیں ہے۔ اسے خرگوش پکڑنا اور مویشی چرانا اچھا لگتا ہے۔"

دوسرا بولا: "جیوا کی اسکول میں پٹائی ہوتی ہے اور تب وہ اسکول کے باہر دوسرے بچوں کو مارتا پیٹتا ہے۔ ہم سب اس سے ڈرتے ہیں۔"

"اس کی ذات کیا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"وہ کولی ہے۔ اس کا باپ سرکاری نوکر ہے اور زبردستی اس کو اسکول بھیجتا ہے۔ ایک ٹیچر تو اسے گھر پر بھی پرائیویٹ ٹیوشن دینے آتے ہیں۔"

"اچھا اس معاملے کو یہاں ہی چھوڑو۔ آؤ کہانی سنو"۔ میں نے کہا۔

میں نے کہانی ختم کی۔ ہم اٹھ ہی رہے تھے کہ اسکول کی گھنٹی بج گئی۔ میں سزا دینے اور اس کے اثرات کے بارے میں سوچتا ہوا گھر چلا۔ مجھے اپنے رویئے پر کافی بھروسہ تھا۔ میں کسی کو بھی سزا دینا نہیں چاہتا تھا۔

IV

کچھ دنوں بعد میں افسر تعلیم سے پھر ملا۔ میں نے کہا: "جناب ایک حکم جاری کر دیجئے کہ اسکول آنے والا ہر لڑکا صاف ستھرے کپڑے پہن کر اسکول آئے۔ اگر وہ ٹوپی پہنتا ہو تو وہ میلی کچیلی نہ رہے، بالوں میں اچھی طرح کنگھی کی گئی ہو، ہر ہفتے ناخن کاٹے جائیں اور سر کے بال بھی برابر کٹوائے جائیں۔ کپڑوں کے بٹن ٹھیک ٹھاک ہوں۔ لڑکے

نہا کر یا پھر کم سے کم منہ ہاتھ پیر دھو کر اسکول آیا کریں۔"

افسر تعلیم دھیان سے میری بات سنتے رہے اور پھر مسکرا کر بولے: "کیوں؟ کیا ماں باپ یہ نہیں سمجھتے؟"

"میں تو والدین کو سمجھانے کی پوری کوشش کر رہا ہوں لیکن لگتا ہے ان کی سمجھ میں ہی نہیں آرہا ہے۔ اچھے کھاتے پیتے والدین بھی نہیں سمجھ پاتے۔ کہتے ہیں کون ہر روز اس سب کی فکر کرے؟ تمھارا کام پڑھانا ہے، بس اسی پر دھیان دو۔ باقی باتیں ہم پر چھوڑ دو۔ ایسے حالات میں تو بہت کم بہتری ممکن ہو سکی ہے۔ سچ تو یہ ہے جناب کہ ایسے بچوں کو پڑھانے کو میرا جی نہیں چاہتا۔"

"اچھا تو یہ بات ہے!" افسر تعلیم بولے "بھئی ہمارا سماج ایسا ہی ہے! ان کے تہذیبی معیار کو اونچا کرنا تقریباً ناممکن ہے۔ پھر بھی جب سے میں نے محکمہ سنبھالا ہے، ماں باپ پر کچھ تھوڑا بہت اثر تو پڑا ہی ہے۔"

"پھر آپ اس طرح کا حکم کیوں نہیں جاری کر دیتے؟"

"میں ایسا حکم جاری نہیں کر سکتا۔ یہ میرے اختیار سے باہر ہے۔"

"آپ کے اختیار سے باہر ہے؟ یہ کیسے؟ آپ تو اعلیٰ درجے کے افسر ہیں۔"

"یہ ایک دیسی ریاست ہے۔ دوسری جگہوں پر بھی افسروں کو ایسے اختیارات نہیں ہیں۔" کچھ دیر خاموش رہ کر وہ بولے۔ "ایسے احکامات اسی وقت جاری کئے جا سکتے ہیں جب آپ سب سے اعلیٰ حاکم کے پاس جائیں۔ لیکن کیا اس کے بعد لوگ اس طرح کا حکم مان ہی لیں گے؟ اگر لوگ حکم کی خلاف ورزی کریں تو پھر ہم کر بھی کیا سکتے ہیں؟"

"ان کے بچوں کو اسکول سے نکال دیں گے۔"

"نہیں آپ ایسا نہیں کر سکتے۔ ایسا کرنا تو بھڑ کے چھتے کو چھیڑنا ہوگا۔"

"ہو تو سب کچھ سکتا ہے۔ ایسی سمجھداری اور لیاقت کا فائدہ ہی کیا جس کے پیچھے اختیار کا سہارا نہ ہو؟ کڑوی حقیقت تو یہ ہے کہ ہم ٹیچرس ہیں مگر ہم کسی گنتی میں نہیں ہیں"

"تو پھر یہی سمجھئے۔ جیسے ہو رہا ہے چلنے دیجئے۔"

"ارے نہیں! جیسے چل رہا ہے وہ تو نہیں چل سکتا۔ جہاں تک میرا سوال ہے، مجھ سے جتنا بھی ہو سکے گا اسکول میں بہتری لانے کی کوشش کروں گا۔ میں بچوں کو نئی

عادتوں کی تربیت دوں گا۔ اس سلسلے میں، ایک عام تحریک چلانے میں اپنا فاضل وقت لگاؤں گا۔ چاہے لوگ اس کی پرواہ کریں یا نہ کریں، یہ حقیقت ہے کہ اسکولوں میں صفائی ستھرائی کا خیال نہ کرنے سے ہی بیماریاں پھیلتی ہیں۔"

ایجوکیشن افسر بولے: "ٹھیک ہے۔ آپ جو چاہیں کریں۔ آپ ایک تجربہ کرنے آئے ہیں۔ چار مہینے بیت چکے ہیں۔ خیال رہے کہ وقت گذرتا جارہا ہے۔"

میں نے ان سے اجازت لی اور گھر واپس آ گیا۔

میں خود پیسے خرچ کرکے دو جھاڑو لایا۔ (فوری ضرورت کے فنڈ میں اتنی بھی رقم نہیں تھی کہ جھاڑو خریدی جاسکتی) میں نے ایک چھوٹا آئینہ، ایک کنگھا، کھدر کا ایک ٹکڑا اور ایک چھوٹی سی قینچی بھی خریدی۔ خوش قسمتی سے اسکول کے احاطے میں پانی کا ایک نل موجود تھا۔ میں نے کلاس میں سب تیاریاں کرلیں۔

میں نے لڑکوں کو ایک قطار میں کھڑا کیا۔ وہ خوشی سے کھڑے ہوگئے اس لیے کہ وہ مجھ سے پیار کرنے لگے تھے۔ وہ جان گئے تھے میں ایسا ہی کام کروں گا جو ان کے لیے مفید ہوگا اور انھیں پسند آئے گا۔ میں نے لڑکوں سے کہا کہ آئینے میں اپنا چہرہ دیکھیں اور جنھیں لگے کہ ان کا منہ، آنکھیں اور ناک گندے ہیں وہ پانی کے نل پر جاکر دھو آئیں وہ ہاتھ پیر بھی دھولیں اور بالوں کو تھوڑا سا بھگولیں۔

سارے بچے تیزی سے باہر بھاگے اور نل پر ایک دوسرے کو دھکے دیتے ہوئے منہ اور ہاتھ پیر دھونے لگے۔

میں سوچ رہا تھا کہ انھیں سلیقے سے یہ کام کرنا سکھانا پڑے گا اور اس کام کے لیے لڑکوں کو قطار میں کھڑا کرنا ہوگا۔ کام ہڑبونگ کے ساتھ نہیں ہوسکتا۔ ہم ان لڑکوں کو اس طرح کی ہبر دھبڑ اور بدنظمی سے بچانا چاہتے ہیں۔

میں نے فرش پر ایک لائن کھینچی اور لڑکوں سے کہا: "تم میں سے ہر ایک اس لائن پر کھڑا ہوجائے اور ایک ایک کرکے نل پر جائے۔"

میں اپنے ہاتھوں میں کھدر کے دو ٹکڑے لے کر ایک طرف کھڑا ہوگیا۔ لڑکے میرے کہنے کے مطابق منہ ہاتھ پیر دھونے لگے۔

اسکول میں پہلی مرتبہ اس طرح کا کام ہو رہا تھا۔ پاس سے گذرنے والے حیران



دیکھو اگر تم سمجھتے ہو کہ تمہارا منہ، آنکھیں یا ناک گندی ہے تو نل پر جا کر دھو لو۔

ہو کر دیکھ رہے تھے کہ اسکول میں یہ کیا ہو رہا ہے۔

جب سب لڑکے منہ ہاتھ دھو چکے تھے تو ہم لوگ اپنی کلاس میں واپس آئے۔ اب میں نے انھیں آئینہ اور کنگھا دیا اور کہا کہ ہر ایک جتنا ہوسکے خوب اچھی طرح اپنے بالوں میں کنگھا کرے۔ میں نے سب کی ٹوپیاں ایک کونے میں رکھوادیں۔ اب ہر ایک صاف ستھرا اور شگفتہ نظر آرہا تھا۔ میں نے کھریا سے ایک گول دائرہ بنایا اور انھیں اس کے چاروں طرف بٹھادیا۔ میں بھی ان کے ساتھ بیٹھ گیا اور بولا: "اچھا اب اپنے ہاتھوں کو دیکھو۔ کتنے صاف ہیں! تمھاری شکل کیسی چمک رہی ہے! کیا تمھیں صاف ستھرا اور اچھا دکھنا پسند نہیں ہے؟"

"کیوں نہیں، بہت پسند ہے۔" انھوں نے جواب دیا۔

"تو پھر کیوں نہ ایسا ہی کیا کریں؟ جیسے ہی تم لوگ اسکول پہنچو سب سے پہلے نل پر ہاتھ منہ دھولیا کرو۔ دوسرے کام ہم لوگ بعد میں کیا کریں گے۔"

مجھے بے حد خوشی ہورہی تھی۔میں نے کہا : "آؤ بچو ایک نظم سنائیں۔"
میں نے جو پہلی نظم سنائی وہ ایک دعا تھی۔جو میرے ذہن میں خود بخود ہی آ گئی
تھی۔اس روز ناخن کی جانچ نہیں ہوسکی نہ ہی بٹن اور کپڑے جانچے گئے۔

V

میں نے اپنی کہانیوں سے تاریخ کی پڑھائی کی بنیاد ڈال دی تھی۔اب میں نے
لوک گیتوں کی مدد سے شعر وشاعری پڑھانے کے لیے زمین ہموار کرنے کا فیصلہ کیا۔اس پر
کافی سوچ بچار کرنے کے بعد میں نے طے کیا کہ پہلے چھ مہینے بعض ابتدائی تیاریوں کے
لیے وقف کردوں گا اور اس طریقے سے میں اگلے چھ مہینوں میں اس مضمون کو پڑھانے
کے لیے زمین تیار کرلوں گا۔

عام طور پر ہوتا یہ ہے کہ کسی بھی نئی چیز کے سلسلے میں طالب علموں کا پہلا
ردعمل اس کا مذاق اڑانے اور اس پر ہنسنے کا ہوتا ہے۔میں نے لوک گیتوں سے شروع کیا
"آؤ چلو ایک گانا گائیں۔" میں نے کہا۔"میں شروع کروں گا اور تم ساتھ دینا۔"

میں نے ایک لوک گیت گانا شروع کیا:-

کانہا کلیجے کی کور سکھی ری
کانہا کلیجے کی کور-------

لیکن کوئی بھی ساتھ نہ دے سکا۔میں حیران تھا۔یہ کیسی بات ہے کہ چوتھے درجے کے لڑکے
اتنی آسان لے بھی نہیں پکڑ سکتے! شاید گانے گنگنانے کی ان کی عادت ہی نہیں ہے۔

میں نے ایک دوسرا گانا چھیڑ دیا:-

"میرا ہے مور۔میرا ہے مور
موتی کو چنتا
میرا ہے مور"

اس بار کچھ لڑکوں نے گایا لیکن ان کی آواز بڑی تیز اور گانا بے سرا تھا۔پھر گانا
ایک شور وغل میں بدل گیا۔قریب کی کلاس کے ٹیچر آگئے اور کہنے لگے : "جناب آپ مہربانی
کردیں۔کافی شور ہوچکا! ہم لوگ اپنی کلاس میں ایک لفظ بھی نہیں سن پارہے ہیں۔"

ایک دوسرے ٹیچر بھی ان کے ساتھ ہوگئے۔بولے :

"کیا آپ کے لیے ہر دن ایک مسئلہ کھڑا کرنا ضروری ہے؟ آپ کو نتیجے کی تو
کوئی پرواہ ہے نہیں۔اگر آپ کامیاب ہوگئے تو ایجوکیشن افسر ہم لوگوں سے کہیں گے کہ
یہ کرو وہ کرو اور اگر آپ کا تجربہ ناکام رہا تو آپ بوریا بستر اٹھا کر چل دیں گے۔"

ہیڈ ماسٹر صاحب بھی آگئے۔بولے : "میں کہتا ہوں لکشمی رام کیا یہ ایک پرائیویٹ
پرائمری اسکول ہے جس میں آپ سہ گان اس طرح گوا رہے ہیں جیسے پہاڑہ پڑھا رہے ہوں؟
اور آپ اسے ایک نیا تجربہ کہتے ہیں! کیوں بھائی لوک گیت تو ہمارے باپ دادا بھی جانتے
تھے!"

اور پھر سب لوگ چلے گئے۔'میں تو بالکل پٹ گیا۔میں نے اپنے آپ سے کہا۔
'کچھ دنوں کے لیے سہ گان گوانا روکنا پڑے گا۔ہم صرف سننے کا ہی پروگرام رکھیں گے۔'

میں نے لڑکوں سے کہا : "ٹھہرو! جب میں گاؤں تو تم لوگ صرف سنو۔"

میں نے گانا شروع کیا:

نبتھ گڑھ دے----موری نبتھ گڑھ دے
پیارے سنتروا
نبتھ گڑھ دے---------

میری آواز تو ایسی تھی کہ بس گدھے کا ہی دل موہ سکتی تھی! ۔لیکن چونکہ میں
زیادہ بے سرا نہیں تھا تو بات بن گئی۔کاش میری آواز اچھی ہوتی! لیکن میں نے گایا بڑے
اسٹائل سے اور ساتھ ہی ساتھ ایسے بھاؤ بھی بتائے جو گانے سے میل کھاتے تھے۔مجھے
ڈراموں میں ایکٹنگ کی بھی کچھ تربیت ملی ہوئی تھی۔کچھ لڑکوں کو شاید میرا گانا پسند آیا
لیکن کچھ بور ہورہے تھے اور انھوں نے شرارتیں شروع کردیں۔چمپک اور اس کے دوستوں
نے ایک دوسرے کو آنکھ ماری جیسے مجھ پر ہنس رہے ہوں۔میں سب کچھ دیکھ رہا تھا۔لیکن
یہی تو وہ باتیں تھیں جنھیں میں سدھارنے جارہا تھا۔



جو طلباء موسیقی کے شوقین نہیں تھے، ان سے میں نے کہا: بھائی تم الگ جا کر بیٹھو۔ اپنی تختی پر جو چاہو لکھو یا کوئی تصویر بناؤ۔

جن لڑکوں کے بارے میں میرا خیال تھا کہ وہ بور ہو رہے ہیں ان سے میں نے کہا کہ "آپ لوگ ذرا الگ بیٹھ جائیں اور اپنی اپنی سلیٹوں پر جو چاہیں لکھیں یا تصویریں بنائیں"

میں نے ایک گانا اور گایا۔ اب لڑکوں کی دلچسپی بڑھ رہی تھی۔ میں نے تیسرا گانا گایا۔ لڑکوں کو میرا دوسرا گانا سب سے زیادہ پسند آیا تھا۔ میں نے اسے بار بار گایا اور ہر مرتبہ ان کی دلچسپی بڑھتی گئی۔

میں نے لڑکوں سے کہا: "جو گیت میں گاؤں، تم لوگ بس اسے سنو۔ ابھی گانا مت۔ خاص طور سے اسکول کی چہار دیواری کے اندر تو ہرگز مت گانا۔"

دو دن کے اندر ہی اندر لڑکے گاتے ہوئے سنے گئے۔ "نبتھ گڑھ دے ۔۔" میں نے ان سے اسکول کمپاؤنڈ سے باہر چلے جانے کو کہا۔

قصبے والے ایک دوسرے سے کہنے لگے۔ "یہ کس قسم کی نظم ہے بھائی؟"

بھانا درزی بولا: "ارے یہ گانا تو نوراتری کے میلے پر بھوائی میں گاتے ہیں۔"

راگھا نے کہا: "اچھا تو ٹیچر بھوائی کے ایکٹر معلوم ہوتے ہیں۔ کیا وہ یہاں بھوائی سکھانے آئے ہیں؟"

لڑکوں کی مائیں الگ پریشان تھیں۔ کہتیں: "لڑکوں کو ایسا گانا کیوں سکھاتے ہیں جو عورتوں کے گانے کا ہے؟"

میں نے ان سب باتوں کو نظر انداز کر دیا۔ اگر میں ان پر دھیان دیتا تو پھر کام کیسے ہوتا؟ مجھے تو ہمت سے اپنے آپ کو تجربے میں لگا دینا تھا۔ ایک نیا راستہ روشن کرنے کا یہی طریقہ ہے۔

میں ہر روز لڑکوں کو نئی نظمیں سناتا اور پوچھتا کہ انھیں کون سی اچھی لگی۔ اسی دوران بہت سے لڑکوں نے آدھے درجن گیت زبانی یاد کر لئے۔ یقیناً ایسے لڑکے بھی تھے جنھیں گانا بالکل پسند نہیں تھا اور وہ اس وقت پڑھتے لکھتے رہتے اور میں ان کے لیے زیادہ فکر نہ کرتا۔

اب میں ڈانڈیہ راس شروع کرنے کی سوچنے لگا۔۔

تو یہ تھیں وہ سرگرمیاں جو ان دنوں کلاس میں چل رہی تھیں: کہانی سنانا، لائبریری، مثالی پڑھائی، کھیل کود، ڈکٹیشن، نظمیں پڑھتے ہوئے سننا، صفائی ستھرائی اور دعا مانگنا۔۔

VI

ایک دن ایک پرم سنیاسی ہماری کلاس میں آئے۔ ہیڈ ماسٹر صاحب بھی ان کے ساتھ تھے۔ انھوں نے سنیاسی جی کا تعارف کرایا: "سنیاسی مہاراج مذہبی لکچر دیتے ہیں۔ انھیں ریاست کے سبھی اسکولوں میں ایسا لکچر دینے کی اجازت دی گئی ہے۔ آج وہ ہمارے اسکول میں ایجوکیشن افسر صاحب کا ایک خط لے کر آئے ہیں کہ وہ اس اسکول میں اپدیش دیں گے"۔

میں نے سنیاسی جی کے آگے بڑے احترام سے سر جھکایا اور انھیں ایک کرسی پیش کی۔ پھر میں نے ان سے اپنی تقریر شروع کرنے کی درخواست کی۔

لڑکے مہاراج کی طرف پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے۔ وہ ان کے منڈے ہوئے سر، چمکتے چہرے، دبلے پتلے جسم اور ان کے پانی کے کمنڈل کے بارے میں جو ان کے ہاتھ میں تھا جاننے کے لیے تجسس ظاہر کر رہے تھے۔ میں نے لڑکوں سے کہا: "سوامی جی ہمیں اپدیش دیں گے مہربانی کر کے غور سے سنو" لڑکوں نے میری بات مانی اور خاموشی سے بیٹھ گئے۔

سوامی جی نے وعظ شروع کیا: "بچو اس دنیا میں ایشور ہی سب سے بڑا ہے۔ اس نے یہ دنیا بنائی ہے اور اسی کی وجہ سے یہ قائم ہے۔ ہم سب اسی کے وسیلے سے پیدا ہوئے ہیں۔"

خدا کی شان کے بارے میں بات اسی طرح چلتی رہی۔

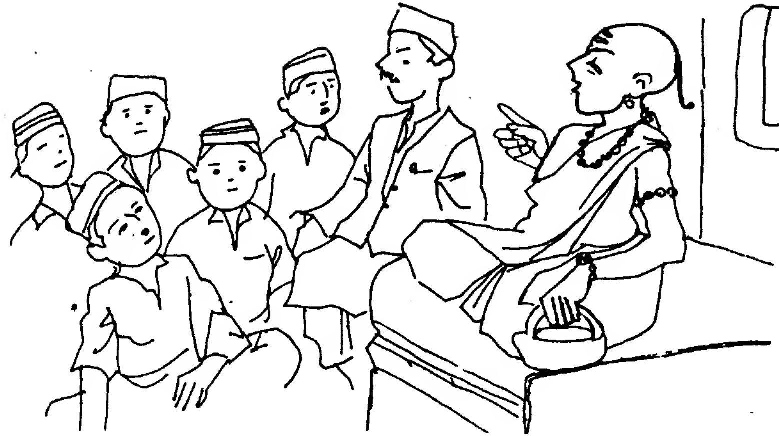
میں چپ رہا اور کچھ نہیں بولا: بچے بھی خاموش تھے، پھر آہستہ آہستہ وہ بے چین ہونے لگے۔ کچھ ہلنے جلنے لگے تو کچھ نے اپنی سلیٹ پنسلوں سے کھلواڑ شروع کر دیا اور بعض نے کتابیں اٹھالیں۔ کچھ لڑکے جھنجھلائے سے نظر آرہے تھے۔ ایک لڑکا یہ اشارہ کرتے ہوئے کہ غسل خانے جا رہا ہے، باہر نکل گیا۔ جلدی ہی دوسرا لڑکا بھی اس کے پیچھے ہولیا۔ دو لڑکے باتیں کرنے کی کوشش کر رہے تھے مگر میں نے انھیں خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔

میں نے مہاراج سے درخواست کی: "سوامی جی، مہربانی سے کچھ ایسی باتیں بتائیے جنھیں لڑکے آسانی سے سمجھ سکیں"۔

سوامی جی کھرے آدمی تھے۔ انھوں نے ہندو دھرم اس کے عقیدوں اور اس کی کتابوں کا ذکر شروع کر دیا۔ بچوں کو اس سے بھی کوئی دلچسپی نہیں ہوئی۔

میں سوچ میں پڑ گیا۔ "کیا مذہبی پرچار کا یہی طریقہ ہے"۔ کیا اس طرح کوئی، مذہب کی فلسفیانہ بنیاد کو سمجھا سکتا ہے جو انتہائی روحانی ہے اور جسے سمجھنے کے لیے عمر بھر کی کوشش درکار ہوتی ہے؟ کیا یہ اخلاقی تعلیم ہے یا مذہب کے بارے میں دوسروں کو معلومات بہم پہونچانا ہے؟ اس طرح کی مذہبی معلومات تو ایک بے جان جسم کی طرح ہے۔"

میں انھیں سب باتوں پر غور کر رہا تھا کہ سوامی جی نے اشلوک پڑھنا شروع



مہاراج کی سج دھج اور ان کے ہاتھ کا کمنڈل بچوں میں دلچسپی جگانے کے لیے کافی تھے۔

کر دئیے۔ لڑکوں نے بھی جہاں تک ان سے بن پڑا ان کے ساتھ انھیں دوہرایا لیکن ان کی سمجھ میں ایک لفظ بھی نہیں آیا تھا۔ وہ تو بس مزا لینے کی خاطر آوازیں نکال رہے تھے۔

سوامی جی اس سب کے بارے میں کافی سنجیدہ تھے۔ ان کے لئے یہ ایک انتہائی ضروری اور پاکیزہ فرض تھا۔ وہ اپنا فرض تو ضرور ادا کر رہے تھے لیکن جہاں تک لڑکوں کا تعلق ہے یہ فرض بھینس کے آگے بین بجانے کی طرح تھا۔

سوامی جی نے اشلوک کے معنی سمجھانا شروع کر دیے۔ بچوں کو سننا ہی پڑا۔

سوامی جی نے اشلوک بلیک بورڈ پر لکھ دیے اور لڑکوں سے کہا کہ انھیں کاپی میں نقل کرلیں۔ پھر بولے: "دیکھو ان اشلوکوں کو صبح اٹھ کر اور رات کو سوتے وقت ضرور پڑھ لیا کرنا۔ اس سے تمھاری بدھی تیز ہوگی، طاقت بڑھے گی، اور تم بہت خوش رہوگے۔"

میری کلاس کے لڑکے دس سے لے کر بارہ برس کی عمر کے تھے۔ مذہب اور اشلوکوں سے انھیں کیا دلچسپی ہوسکتی تھی!

پھر بھی انھوں نے اشلوک اور ان کے مطلب نقل کر لئے۔

میں دل ہی دل میں سوچ رہا تھا: "ایسا لگتا ہے کہ سادھوؤں کے لیے اب پرچار کرنے کی کوئی اور جگہ نہیں رہ گئی ہے اور وہ اسکولوں میں آنے لگے ہیں! پرانے زمانے میں مندروں میں جو پرچار ہوتا تھا گھروں پر، ماں باپ اس پر عمل کیا کرتے تھے اور بچوں کی

بھی وہی مذہبی تعلیم ہوجاتی تھی ۔ لیکن اب کیا اس وجہ سے کہ ان کے پاس مذہبی لکچر سننے کا وقت نہیں ہوتا یا اس لئے کہ بزرگوں کا زمانہ چلا گیا، چاہے جو بھی وجہ ہو، یہ کام اسکولوں کو سونپ دیا گیا ہے ؟"

میں یہ سب سوچ ہی رہا تھا کہ گھنٹی بج گئی ۔ تھکے ہوئے طالب علموں نے سوامی جی کو نمستے کیا اور کلاس سے باہر نکل گئے ۔ کلاس میں بس میں اور سوامی جی رہ گئے ۔ میں نے کہا: "مہاراج ۔ آپ آج میرا مہمان بننا قبول کریں"۔

رات کے کھانے پر ہماری بات چیت میں مذہبی تعلیم کا ذکر آیا سوامی جی مہاراج نے کہا: "آج مذہب کی اتنی عزت نہیں کی جاتی جتنی کہ پہلے ہوتی تھی ۔ اسی لئے مذہبی تعلیم جتنی جلدی ہو سکے شروع کی جانی چاہئے۔"

میں نے کہا مہاراج بچوں کے اس قدر نازک اور کچے ذہن، خدا، روح، مذہب، اور ایسے ہی دوسرے تصورات کو کیسے سمجھ سکتے ہیں ؟ آپ نے خود دیکھا کہ بچوں کو ان باتوں میں کوئی دلچسپی نہیں تھی اور وہ پورے وقت بس لحاظ میں بیٹھے رہ گئے تھے۔"

سوامی جی بولے : "ہاں بات تو بالکل سچ ہے بچوں کو کھیلنا اچھا لگتا ہے، انھیں کہانیوں میں مزا آتا ہے لیکن چاہے انھیں پسند ہو یا نہ ہو، ہمیں اپنی مذہبی کتابیں انھیں ضرور پڑھانی چاہئیں اور بچوں کو انھیں زبانی یاد کرانا چاہیے۔"

میں نے احتجاج کرتے ہوئے کہا: "لیکن سوامی جی مذہب جاننے کے معنی یہ تو نہیں کہ وہ صرف زبان کی نوک پر ہو ۔ مذہب تو ایک طرح کی جاگرتی ہے جو کہ اندر سے پیدا ہوتی ہے اور یہ اسی وقت ہوتا ہے جب اس کی لگن ہو ۔ اور وہ تو صرف مناسب وقت پر ہی ہوتا ہے کیا آپ یہ محسوس نہیں کرتے کہ یہ غلط وقت پر زبردستی تھوپنا ہے ؟"

سوامی جی میری بات پر غور کر رہے تھے ۔ میں کہتا رہا ۔ "مذہب تو ایک سچائی ہے اور نجات دہندہ ہے ۔ انسان کا آخری مقصد نجات ہے ۔ لیکن کیا آپ کو نہیں لگتا کہ یہ سب کچھ بڑا مشکل ہے، عام سمجھ بوجھ سے باہر ؟ کیا آپ یہ نہیں سوچتے کہ اس کے لئے زبردست تیاریوں کی ضرورت ہے ؟"

"یہ تو ٹھیک ہے لیکن....."

میں بولتا رہا : "مذہب کوئی ایسی چیز تو نہیں جو بازار میں خریدی جا سکے ۔ کتابوں

میں چھپی ہوئی باتیں تو مذہب نہیں ہوتیں ۔ کیا آپ نہیں سوچتے کہ معرفت کی بات کو تو پوشیدہ ہی رکھنا چاہئے اور ہر آدمی کو خود اپنی کوششوں سے اس کا پتہ لگانا چاہئے ؟"

سوامی جی بات مان گئے ۔ بولے "ہاں ۔ اسی لئے تو ہمارے باپ دادا آشرم میں رہتے تھے اور مذہب کو سمجھنے کے لیے سخت محنت مشقت کرتے تھے۔"

"لیکن آج تو ایسا لگتا ہے کہ ہم گھر گھر اور اسکولوں میں پرچار کر کے لوگوں میں مذہب کا تبرک بانٹ رہے ہیں !"

سوامی جی بولے : "لیکن یہ تو کل یگ ہے نا؟ آج کون گرو کے آشرم میں جائے گا؟"

"تو پھر اسے چھوڑئیے" ۔ میں نے جواب دیا "مذہب بیچنے اور لوگوں کو تحفے میں بانٹنے سے تو قائم نہیں رہے گا۔"

"تو پھر کیا کیا جائے ؟"

میں نے کہا ۔ "میرا خیال ہے کہ چھوٹے بچوں میں مذہب کا پرچار بالکل نہ کیا جائے ۔ انھیں تو اس عمر میں ایک صحت مند جسم، ایک صحت مند دماغ، کھلے ذہن اور کام کرنے کی اَنتھک صلاحیت کی ضرورت ہوتی ہے ۔ ہمیں ہر طرح سے انھیں مضبوط بنانا چاہئے"۔

"سو تو ہے ۔" سوامی جی بولے ۔ "صرف مضبوط لوگ ہی روح تک پہونچ سکتے ہیں"۔

میں نے کہا : "میرا پکا یقین ہے کہ جیسے اپنے وقت پر جوانی کھل اٹھتی ہے اسی طرح مذہب جاننے کے لئے بھی اپنے وقت پر ہی دل میں امنگ پیدا ہو گی ۔ دھرم کے بارے میں بے وقت بتلانا ویسا ہی ہے جیسے کہ بے وقت کسی کی شادی ہو جائے ۔ دھرم یا مذہب کو اشلوک پڑھنے اور روزانہ کچھ مذہبی رسمیں ادا کرنے کا معاملہ بنا دینے سے اس کے لئے دلی امنگ کی شدت میں کمی آجائے گی ۔ ایک آدمی ساری زندگی اشلوک پڑھتا رہے، روزانہ کی مذہبی رسمیں ادا کرتا رہے، اور مذہب کے تعلق سے ساری باتوں پر قائم رہے، لیکن ہو سکتا ہے وہ تب بھی ایک سچا مذہبی آدمی نہ ہو !"

"میں مانتا ہوں،" سوامی جی بولے ۔ "اب تک میرا جو ذاتی تجربہ رہا ہے اس سے میں نے بھی یہ محسوس کیا کہ اس طرح کی مذہبی تعلیم سے لڑکے اکتا جائیں گے ۔ میں بھی یہ سوچنے لگا ہوں کہ ہمیں مذہبی تعلیم دینے کا کوئی دوسرا راستہ نکالنا چاہئے ۔"

"معافی چاہتا ہوں مہاراج" میں نے بیچ میں ٹوکا"۔میں جو کہنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ ہمیں مذہب کو زندگی میں سمونا چاہیئے ۔اس سلسلے میں ماں باپ بھی کوشش کریں اور ٹیچر بھی ۔جب کبھی بچوں کے سبق میں ان کا حوالہ ہو تو ہم انھیں پورانوں اور اپنشدوں سے بھی کہانیاں سِنا سکتے ہیں ۔ہمیں صوفی سنتوں کی کہانیاں بھی اسی طرح سنانی چاہئیں جیسے تاریخی ہستیوں کی ۔بس لڑکوں کو اتنا بتادینا یا یوں کہئے کہ ان کے لیے اتنی تیاری کافی ہے ۔ہمیں مذہبی رسومات کے بارے میں بتانا چھوڑ دینا چاہیئے ۔ہمیں اپنے بچوں کو اشلوک نہیں رٹوانے چاہیئے نہ ہی ان سے سنانے کو کہنا چاہیئے ! ہمیں اخلاقی تعلیم کے نام پر انھیں مذہبی عقیدوں اور مذہبی کتابوں وغیرہ کی تعلیم نہیں دینی چاہیئے"۔

سوامی جی بولے "تو پھر اب میں کیا کروں؟"

"پڑھائیے" ۔میں نے کہا۔"اسی طرح جیسے میں پڑھاتا ہوں"۔

سوامی جی نے کہا"ایک سنیاسی ٹیچر کا کام کیسے کر سکتا ہے؟"

"آپ کا کام دوسروں کو تعلیم دینا ہے ۔اگر آپ لڑکوں پڑھانا شروع کر دیں تو ہم اچھے ٹیچروں کی کمی دور کر سکتے ہیں اور واقعی کچھ اچھا کام بھی کر سکیں گے۔"

سوامی جی مسکرائے اور اپنے ہاتھ دھونے لگے ۔

اس دن سے ہم ایک دوسرے کے اور زیادہ قریب آگئے ہیں ۔وہ تعلیم کے نئے رجحانات کے بارے میں پڑھتے رہتے ہیں اور میں ان سے مذہبی کتابیں پڑھتا ہوں ۔

VII

وقت گذرتا جارہا تھا ۔مجھے سال ختم ہونے تک کورس پورا کرلینا تھا اور اپنے پڑھانے کے طریقوں کو بہتر کرلینا تھا ۔اگر تجربے کا کچھ مطلب تھا تو مجھے اپنے طریقوں میں یقیناً بہتری دکھانی تھی ۔

میں نے سوچا تاریخ پڑھانا شروع کروں ۔میں نے تاریخ کی نصابی کتابیں

دیکھیں۔میں مطمئن نہیں ہوا۔ایک کتاب میں تو واقعات کی کچھ غلطیاں نکلیں ، دوسری بڑے پرانے طرز کی لکھی ہوئی تھی ۔ تیسری صرف اس مقصد سے لکھی گئی تھی کہ پیسہ کمایا جائے ۔

چوتھی کا طرز تحریر اور زبان دونوں ہی خراب تھے ۔جو کتاب عام طور پر پسند کی جاتی تھی وہ بڑوں کے لیے تو دلچسپ تھی ،لیکن طالب علموں کے لئے مشکل تھی ۔

مجھے لگا یہ کتابیں تو نہیں چلیں گی ۔"تو پھر کیا کروں؟"

"سوچتا ہوں میں تاریخ کہانیوں کے ذریعے پڑھاؤں گا"۔

سبھی بچوں کو کہانیاں اچھی لگتی تھیں اور میں انھیں ہر طرح کی کہانیاں پہلے سنا بھی چکا تھا ۔ کچھ سچی ، کچھ جھوٹی ۔ خیالی اور پریوں کی کہانیاں ۔ تاریخی کہانیاں تو اس طرح کی ہوتی نہیں ۔میں نے تاریخ کے روکھے پھیکے واقعات کو آپس میں پرو کر کہانی کی شکل دی اور سنانا شروع کیا۔بچے بے چین ہونے لگے ۔

"ماسٹر صاحب، یہ کہانی تو نہیں ہے" انھوں نے شکایت کی۔

"جناب ہم اس طرح کی کہانیاں نہیں سننا چاہتے"

"جناب مہربانی کر کے ہمیں وہ کہانی پھر سنادیجئے جو آپ نے کل سنائی تھی۔"

"چلئے ٹیچر کھیلنے چلیں۔"

"یا پھر آئیے گانا گائیں۔"

مجھے احساس ہوا کہ میں ناکام رہا تھا ۔بچوں نے چاروں طرف سے مجھے گھیر لیا اور کھیلنے کے لیے باہر لے جانے کے واسطے ہلکے سے میرا ہاتھ کھینچنے لگے ۔

اس رات میں نے اس معاملے پر غور کیا۔صرف تاریخی واقعات سے ،جیسے کہ وہ ہیں ،چپکے رہنے سے کام نہیں چلے گا۔اور جو باتیں واقعات بتا کر لکھی ہیں انھیں کس نے دیکھا ہے ؟ شاید کہانیوں کے ذریعے ہی تاریخ کو دلچسپ بنایا جاسکتا ہے ۔مجھے چاہیئے کہ جہاں کہیں ممکن ہو وہاں کچھ فرضی تفصیلات کے ساتھ انھیں تاریخ کی کہانیاں سناؤں ۔

اگلے دن میں نے کہانی شروع کی ۔ "ایک بڑا سا جنگل تھا ۔وہاں بھیل لوگوں کی بستی تھی ۔ بھیل ایک بڑی مضبوط اور صحت مند قوم ہے ۔یہ لوگ بہترین تیر انداز ہوتے ہیں ۔یہ اڑتی چڑیا مار گراتے ہیں ۔جنگل میں ایک چھوٹی سی جھونپڑی تھی ۔"

بچوں نے دلچسپی سے سننا شروع کیا۔میں نے انھیں ون راج کی کہانی سنا رہا تھا۔ میں واقعات میں رنگ بھر رہا تھا۔

اس روز کہانی ادھوری رہ گئی۔

دوسرے دن لڑکوں نے کوئی اور کام نہیں کرنے دیا۔ کہنے لگے : "آپ ہمیں ون راج کی کہانی سنائیے"۔

میں نے انھیں کہانی سنائی۔جب وہ ختم ہوگئی تو میں نے کچھ ہچکچاتے ہوئے ان سے پوچھا: "بھئی جو بچے اس کہانی کو دوبارہ سننا چاہتے ہیں وہ کھڑے ہوجائیں"۔

پوری کلاس کھڑی ہوگئی۔

اگلے دن وہی کہانی پھر سنائی گئی۔میں روزانہ انھیں تاریخ سے کہانیاں سناتا رہا۔ اب کسی کو کھیلنے یا گانا گانے کی خواہش نہیں تھی۔

میں سوچا کرتا تھا کہ دیکھیے آخر کب تک ان کی یہ دلچسپی قائم رہتی ہے۔ کسی نے ایجوکیشن افسر سے جا کر کہا: "وقت بتادے گا کہ تجربے کا کیا حشر ہوا۔اور تب آپ ٹیچر پر الزام لگائیں گے اور کہیں گے کہ وہ ناکام رہا، لیکن ان بچوں کا کیا ہوگا جن کا ایک سال برباد جائے گا؟"

مجھے تعجب نہیں کہ کوئی ٹیچر صاحب ہی وہاں پہونچے ہوں اور ایجوکیشن افسر سے شکایت کی ہو۔ میرے لڑکے خوش تھے اور خوب ترقی کر رہے تھے، جبکہ دوسرے درجوں کے لڑکے غیر مطمئن تھے ۔ وہ کلاس میں دھیان نہ دیتے اور شرارتیں کرتے ۔ وہ چاہتے کہ ان کے ٹیچر بھی انھیں کہانیاں سنایا کریں اور اس پر ٹیچروں کو غصہ آتا۔

"میرے دوستو" میں نے ان سے کہا۔"آپ اپنے راستے پر چلیں اور مجھے میرے راستے پر چلنے دیں۔ میرا تو ایک تجربہ ہے، لیکن مجھے اس پر پورا بھروسہ ہے۔میں بھی اس بارے میں کہ لڑکوں کا سال خراب نہ ہو اتنا ہی فکرمند ہوں جتنا کہ آپ، اور اسی لئے میں سخت محنت کر رہا ہوں۔لیکن کام کرنے کے میرے اپنے طریقے ہیں اور آپ کے اپنے۔ اگر آپ چاہتے ہیں تو میں اپنی کلاس کہیں اور جا کر لگالیا کروں"۔

ون راج زمانہ وسطی میں گجرات کا ایک راجہ۔

ایک دن ایجوکیشن افسر میری کلاس دیکھنے آئے۔ اس میں شک نہیں کہ وہ بڑے اچھے آدمی تھے لیکن وہ یہ دیکھ کر کچھ غیر مطمئن ہوئے کہ سارا وقت کہانیوں کو ہی دیا جاتا ہے۔انھوں نے مجھ سے کہا: "لکشمی رام صاحب بچے اس طریقے سے تاریخ تو نہیں سیکھ سکتے۔ جب تک یہ کہانی ہوگی انھیں اچھی لگے گی اور بس۔اصل بات کیا ہے، وہ انھیں یاد نہیں رہے گی۔ تو حاصل کیا ہوگا۔ آپ کے پڑھانے اور ان کے پڑھنے سے؟"

مجھے لگا شاید وہ ٹھیک ہی کہہ رہے تھے۔ آج کل لڑکوں کو تاریخ میں اصل نکتے تو یاد ہونے ہی چاہئیں ورنہ وہ تاریخ کے امتحان میں فیل ہوجائیں گے۔میں امتحان کی پابندیوں پر کاربند رہنے کے لیے مجبور تھا۔

ایک دن میں نے لڑکوں کو جانچا۔میں انھیں تیسری بار ون راج کی کہانی سنا رہا تھا۔میں نے تفصیلات ذرا سا بدل دیں۔لڑکوں کو پتہ چل گیا۔بولے "جی نہیں اس طرح نہیں تھا پچھلی بار آپ نے کہا تھا کہ ایک ہزار گھوڑے تھے اور اب آپ کہہ رہے ہیں کہ پچاس تھے۔یہ کیسے؟ پچھلی مرتبہ تو جھونپڑی دریا کے کنارے تھی اور آج آپ کہتے ہیں کہ"----- اور وہ اسی طرح بتاتے گئے۔

مجھے بڑا تعجب ہوا۔ان لڑکوں نے تو بہت ساری تفصیلات یاد رکھی تھیں۔مجھے بھروسہ ہوگیا کہ وہ بھولیں گے نہیں۔

لیکن تاریخ کے امتحان کے لیے خیالی تفصیلات سے تیار کی ہوئی کہانی مناسب نہیں ہوتی۔یہ کہانیاں ممتحن کی دوربین کے دائرے کے اندر ضرور لائی جانی چاہئیں۔

میں نے جتنی کہانیاں سنائی تھیں وہ لکھ ڈالیں اور لڑکوں کو پڑھنے کے لیے دیں۔ میں نے کہانیوں کو مختصر کردیا اور جہاں کہیں ضروری تھا وہاں جگہ اور تاریخ کے لحاظ سے تاریخی واقعات ڈالدیے۔ کہانیاں سنانے اور کہانیاں لکھنے کے انداز میں فرق ہوتا ہے۔میں نے اس کا فائدہ اٹھایا اور لڑکوں کو یہ کہانیاں پڑھنا اچھا لگا۔

پھر بھی مجھے اس کا یقین نہیں تھا کہ اس مضمون پر پوچھے گئے سوالات کا لڑکے جواب دے سکیں گے یا نہیں۔

میں نے ایک کہانی کے اہم نکتے نکال کر ان سب کو ایک جملے میں لکھا۔ یہ کہانی کا خاکہ تھا۔ محض نکتے۔میں نے انھیں لڑکوں کو پڑھنے کے لیے دیا۔

لڑکوں نے انھیں پڑھا۔ خاکہ پڑھتے ہوئے انھیں لگا کہ وہ کہانی تفصیل سے یاد کرسکتے ہیں۔ ایک دن میں نے ان سے کہانی کی تفصیلات معلوم کرنے کے لیے سوالات پوچھے۔ تعجب ہوا کہ انھوں نے بڑی جلدی جلدی سوالات کے بالکل صحیح جواب دئیے تھے۔ مجھے یقین ہوگیا کہ وہ نہ صرف امتحان ہی پاس کرلیں گے بلکہ ضروری واقعات کو بھولیں گے بھی نہیں۔

میں نے ایجوکیشن افسر سے درخواست کی کہ وہ آئیں اور محض اندازہ لگانے کے لیے لڑکوں کا تاریخ کا امتحان لیں۔ ٹیسٹ لینے کے بعد انھوں نے کہا: "یہ اچھا معلوم ہوتا ہے۔ ہمیں تاریخ پڑھانے کا یہ طریقہ اور درجوں میں بھی شروع کرنا چاہئے"۔

میرے سینے پر سے ایک بوجھ ہٹ گیا۔

اب چار مہینے بیت چکے تھے۔ جو کامیابی مجھے حاصل ہوئی تھی اس سے میری ہمت بڑھی تھی۔ لیکن ابھی تو بہت کچھ کرنا باقی تھا!

تیسرا حصہ

چھ ماہ کے بعد

۱

ہر سال کی طرح جیسا کہ رواج تھا، ہمارے اسکول میں جلسے کی تیاریاں شروع ہو گئیں ۔ کمشنر صاحب اسکول میں آنے والے تھے ۔ عموماً یہی ہوتا تھا کہ اسکول ایک پروگرام تیار کرتا جس میں چھوٹا سا ایک ڈرامہ دکھایا جاتا، نظمیں سنائی جاتیں اور ڈرل ہوتی، پھر کمشنر صاحب انعامات تقسیم کرتے اور اسکول کے سبھی لوگوں کو مٹھائی کی ایک ایک تھیلی ملتی۔

ہیڈ ماسٹر صاحب نے سب لڑکوں کو جمع کیا تھا اور ایسے لڑکوں کا انتخاب کر رہے تھے جو ان کے خیال میں اچھا گا سکتے تھے یا اچھا مکالمہ بول سکتے تھے ۔ مجھے بھی اس کی اطلاع بھیجی گئی تھی لیکن میرے درجے کے لڑکے انتخاب کے لیے وہاں نہیں گئے ۔ ہیڈ ماسٹر صاحب نے جواب طلب کیا تو میں نے کہا : "میری کلاس کے لڑکے اس پروگرام میں حصہ نہیں لیں گے ۔"

"کیوں نہیں ؟"

اس پروگرام کا مقصد صرف کمشنر صاحب کو خوش کرنا اور انھیں مرعوب کرنا ہے ۔ میں نے سیدھا جواب دیدیا۔

"لیکن یہ تو ہم ہمیشہ ہی کرتے ہیں۔" ہیڈ ماسٹر صاحب نے احتجاج کیا۔ "ایجوکیشن افسر چاہتے ہیں کہ ہم پروگرام پیش کریں ۔"

"ہو گا ۔" میں نے جواب دیا۔ "لیکن میں یا میرے طالب علم اس میں حصہ نہیں لیں گے ۔"

ہیڈ ماسٹر بولے ۔ "تب تو میرا خیال ہے ایجوکیشن افسر کو اطلاع دینی ہو گی کہ آپ تعاون نہیں کر رہے ہیں اور گڑبڑ پیدا کر رہے ہیں ۔"

"جی ہاں - انھیں ضرور لکھ دیجئے - میں انھیں مناسب جواب بھیج دوں گا۔"

ہیڈ ماسٹر صاحب جھنجھلائے ہوئے تو تھے ہی، اسی لمحے رپورٹ لکھنے بیٹھ گئے۔

اسی دوران پروگرام میں حصہ لینے والے لڑکوں کے انتخاب کا کام جاری رہا۔ سنسکرت کے اشلوک سنانے کے لیے شام جی اور بھیم جی، نظمیں پڑھنے کے لیے دیواجی اور بھیم جی، اور ڈرامے میں حصہ لینے کے لیے رام نک، نیم چند اور مگن لال کو چنا گیا اور ڈرل کے لیے چند اچھے جسم والے قبول صورت لڑکے لئے گئے۔

ہیڈ ماسٹر صاحب کے ساتھ جھڑپ کی وجہ سے میں غصے میں تھا اور اندر ہی ابل رہا تھا۔ "شاباش ہیڈ ماسٹر !" میں نے ناراض ہو کر سوچا۔ "اسکول اور موجودہ تعلیمی طریقوں کو میرا اسلام - جہاں ایسے بچوں کو چنا گیا ہے جنھیں ان مضامین سے کوئی تعلق ہی نہیں جن کے لیے وہ چنے گئے ہیں ! شام جی اور بھیم جی کی آوازیں اچھی ہیں - ٹھیک ! وہ برہمن ہیں اور ہوسکتا ہے انھوں نے گھر پر سنسکرت کے اشلوک سنے ہوں - لہذا انھیں چن لیا گیا۔ لیکن غریب بچوں کی تو یاد داشت بھی کمزور ہوتی ہے ! سنسکرت کے اشلوک یاد کرتے کرتے وہ تو جیسے چور ہو جائیں گے - لیکن ایسے حالات میں تو ایسی چیزیں ضرور ہوتی ہیں۔" میں افسردہ سا گھر پہونچا - جوں ہی میں نے کھانا ختم کیا، مجھے ایجوکیشن افسر کا ایک خط ملا کہ میں ان سے ملوں - میں سمجھ گیا کہ معاملہ کیا ہے - دل ہی دل میں خدا سے دعا مانگتا ان کے دفتر میں داخل ہوا - صاف نظر آرہا تھا کہ ایجوکیشن افسر بگڑے ہوئے ہیں - ان کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا، اور تیوری چڑھی ہوئی تھی - ان کے ہونٹوں پر جہاں مونچھیں نہیں تھیں ایسا لگتا تھا ہلکی سے مسکراہٹ ہے، لیکن وہ بہت زیادہ ناراض تھے - انھوں نے مجھ سے بیٹھنے کو کہا اور بولے :

"آخر آپ کے بچوں کو اسکول کے سوشل پروگرام میں حصہ کیوں نہیں لینا چاہئے ؟" انھوں نے مجھ سے پوچھا "ان میں بعض تو کافی قبول صورت اور ہوشیار ہیں۔"

میں بظاہر پرسکون تھا لیکن دراصل جھنجھلایا ہوا تھا - میں نے جواب دیا : "تو پھر ؟ کیا وہ قبول صورت اور سمجھدار لڑکے دوسروں کا دل بہلانے کے لیے ہیں ؟ اچھلنے کودنے والے بندر ہیں، جو دوسروں کے سامنے ناچ دکھائیں تاکہ اسکول کی تعریف ہو؟"

میرے تیکھے جواب نے انھیں کچھ دھیما کر دیا۔ انھوں نے کہا : "برائی کیا ہے ؟ یہ کوئی نئی بات تو ہے نہیں - ایسا تو برسوں سے ہوتا آرہا ہے - جب بھی کمشنر صاحب اسکول

جاتے ہیں ایسا ہی ہوتا ہے -"

"معاف کیجئے گا جناب -" میں بھی کچھ دھیما پڑ گیا اور میں نے کہا - "ہوسکتا ہے یہ ہمیشہ کا رواج ہو - لیکن ہمیں اسے ختم کرنا چاہئے - یہ تو سراسر ریاکاری ہے آپ کی - اس طرح تو ہم کمشنر کو دھوکہ دے رہے ہیں !"

"وہ کیسے ؟"

"جو کچھ بھی ہم انھیں دکھانے جا رہے ہیں وہ مجبور کئے جانے اور زور زبردستی کا نتیجہ ہے - وہ رٹائی کا نتیجہ ہے - اور یہ رٹائی بھی ٹیچروں کے ہاتھوں طالب علموں کی پٹائی کے وجہ سے ہوئی ہے - یہ درجے کے اندر کام کا قدرتی نتیجہ نہیں ہے - لڑکوں کے دماغ میں جو کچھ ٹھونس دیا گیا ہے وہ ایک مشین کی طرح اسے اگل دیں گے اور وہ بھی جب کہ اسٹیج کے پیچھے سے انھیں لقمہ دیا جائے گا - اس طرح کی چیز سے لڑکے بڑے تناؤ سے گذریں گے اور صحیح معنوں میں سیکھنے میں رکاوٹ پڑے گی - اور تناؤ تو نقصان دہ ہوتا ہی ہے - اس طرح کے تماشے میں، وہ بچے جو چنے گئے ہیں، خوب تیاری کرنے کے بعد شریک ہوں گے۔"

ایجوکیشن افسر چند سیکنڈ سوچ میں پڑ گئے - پھر بولے - "لیکن آپ دھوکہ دینے کی بات کر رہے تھے - دھوکے کی بات کہاں سے آ گئی ؟"

"دھوکہ ہماری اس کوشش میں ہے جو ہم کمشنر صاحب پر یہ اثر جمانے کے لیے کر رہے ہیں کہ ہمارے لڑکے بڑے ہوشیار ہیں، ہمارا اسکول بہت اچھا ہے اور ہمارا کام شاندار -" میں نے جواب دیا۔ "لیکن ہمیں خوب معلوم ہے کہ اصلیت کیا ہے - کیوں ؟ کیا ہم نہیں جانتے ؟"

ایجوکیشن افسر خاموش رہے - وہ سوچ میں پڑ گئے تھے - میں نے اپنی بات جاری رکھی - "ہم نہ صرف خود ریاکاری سے کام لے رہے ہیں بلکہ بچوں کو بھی اسی راستے پر لے جا رہے ہیں - ظاہر ہے کمشنر صاحب یہ دکھائیں گے کہ وہ بڑے خوش ہوئے اور انعامات تقسیم کرنے کے موقعہ پر ایک تقریر کریں گے - وہی جو ہمیشہ ہوتی ہے کہ 'میں لڑکوں کے کام سے بڑا خوش ہوں - انھوں نے سب کچھ بڑی سمجھداری اور ہوشیاری سے پیش کیا - واقعی بعض لڑکے تو ایسے ہیں جن میں کافی صلاحیت ہے، جو بعد میں، اچھے عالم، اچھے شہری اور اچھے انسان ثابت ہوں گے - میں آپ کی اس اسکیم سے خوش ہوں کہ ان کی ہمت افزائی کے

لئے انھیں انعام دئیے جائیں ۔اور آج انھیں انعامات تقسیم کرتے ہوئے مجھے انتہائی خوشی ہورہی ہے ۔' کیا یہ سب ان کے دل سے نکلی آواز ہوگی ؟ کیا وہ نہیں جانتے کہ ہم نے سب کچھ ان پر رعب ڈالنے کے لیے کیا ہے ؟ آپ ،لڑکوں کے ماں باپ ،اور ٹیچر ،ہم میں سے ہر ایک جانتا ہے کہ اگر لڑکوں پر سے ان کی رٹی رٹائی نظموں اور اشلوکوں اور سخت محنت سے کرائی گئی تیاری کا ملمع ہٹا دیا جائے تو وہ کس قسم کے عالم ،شہری اور انسان ثابت ہوں گے ۔"

ایجوکیشن افسر بولے ۔ "بھئی آپ تو عجیب خبطی ہیں ۔ آپ کی باتیں عمل میں آ کہاں سکتی ہیں ؟ آپ دنیا داری نہیں سمجھتے ۔ آپ کے لیے اصول ہی سب کچھ ہیں ! ہمیں تو اور بھی پہلو دیکھنے پڑتے ہیں ۔"

میں نے کہا : "ٹھیک ہے آپ سارے پہلوؤں پر غور کریں ۔ مگر میں اس میں شامل نہیں ہوں گا ۔مجھے یہ سب تماشہ پسند نہیں ۔"

"تو پھر ؟"

"میری کلاس کو اس سے الگ کر دیجئے ۔"

میں نے کہا : میں اس میں حصہ نہیں لے سکوں گا ۔یہ دھاندلی میں برداشت نہیں کر سکتا ۔

"یہ تو کچھ مشکل نظر آتا ہے ۔دوسرے ٹیچر اور افسران اور ---اور ---اب دیکھئے نا، اس سے میرے لیے نئے مسئلے پیدا ہوجائیں گے ۔سچ تو یہ ہے کہ میں نے سوچا تھا کہ کمشنر صاحب آپ کی کلاس کے بچوں کو جن کی تیاری بڑی اچھی ہوگی ،دیکھ کر خوش ہوں گے ۔ لگتا ہے آپ تو ------"

میں نے بات کاٹی ۔"مہربانی کرکے مجھے کم از کم اس پروگرام سے تو چھوٹ دلا ہی دیجئے ۔میں کمشنر صاحب کو دکھانے کے لئے کچھ اور تیاری کرلوں گا ۔ یہ تیاری کچھ اس طرح کی ہوگی کہ لڑکوں کا وقت ضائع نہیں ہوگا ،ان پر کسی طرح کا بوجھ نہیں پڑے گا اور کوئی ڈھونگ یا دکھاوا نہیں ہوگا ۔مجھے یقین ہے کہ آپ دونوں ہی اسے پسند کریں گے ۔"

ایجوکیشن افسر نے کچھ دیر سوچا اور پھر بحث ختم کرنے کی کوشش میں انھوں نے کہا : "تو ٹھیک ہے میں ہیڈ ماسٹر کو لکھ دوں گا کہ اس کام سے آپ کو الگ رکھیں ۔لیکن دیکھئے انھیں اب اور ناراض مت کیجئے گا ۔ وہ ذرا پرانے خیال کے آدمی ہیں اور آپ ایک انتہائی جوشیلے نوجوان ۔ مجھے تو آپ دونوں ہی کو اپنی طرف رکھنا ہے ۔اور یہ کام واقعی بہت مشکل ہے ۔"

میں نے ان کے اس روئیے کو اپنے طور پر پسند کیا اور بغیر کچھ کہے وہاں سے اٹھ گیا ۔

اسکول میں تیاریاں اپنے پورے زور پر تھیں ۔ کمشنر صاحب کی آمد کے امکان سے سبھی لوگ بڑے جوش میں تھے ۔جب وہ دن آیا تو بڑے چھوٹے سبھی افسران ،قصبے کے تمام اہم شہری اور طالب علم سبھی موجود تھے ۔ہم سب ٹیچر بھی چوکس تھے ۔ دل میں تو ڈرے ہوئے تھے کہ دیکھئے اب کیا ہوتا ہے ، کیونکہ ہم ہی لوگ انتظام کر رہے تھے ،لیکن اوپر سے ہم ظاہر کر رہے تھے کہ ہمیں اپنے اوپر پورا بھروسہ ہے ۔ہیڈ ماسٹر صاحب نے اسکول کے اودھم مچانے والے اور شریر لڑکوں کو ایک طرف لے جا کر خبر دار کیا ۔" دیکھو اگر آج تم لوگوں نے ذرا بھی اودھم مچایا یا کوئی گڑبڑ کی تو کل تمھاری اچھی طرح مرمت کروں گا ۔"

کمشنر صاحب آئے تو زبردست تالیوں سے ان کا سواگت ہوا ۔اور اس کے بعد سنگیت گونج اٹھا ۔ پھر ہیڈ ماسٹر صاحب نے جو کہ بڑے چاق و چوبند اور اہم نظر آرہے تھے ، اسکول کی رپورٹ بڑی بلند آواز سے اور کبھی کبھی آواز میں زور پیدا کرتے ہوئے پڑھنا شروع

کی ،جیسے وہ سب کو اور خود اپنے آپ کو بھی اس بات کا یقین دلا رہے ہوں کہ وہ اندر ہی اندر کپکپا نہیں رہے ہیں ! رپورٹ کے اختتام تک پہونچتے پہونچتے انھیں پسینہ چھوٹ گیا اور ان کی آواز بیٹھ گئی۔

رپورٹ پیش ہو چکی تو نظمیں وغیرہ پڑھی گئیں اور پھر ایک چھوٹا سا ڈرامہ کھیلا گیا۔ لڑکے اسٹیج پر بے جان مشین کی طرح بولتے رہے ۔ ان کے چہروں پر کوئی تاثر نہ تھا۔ وہ اونچی آواز سے بولتے اور جب بولتے تو اپنے ہاتھ پیر بھی ہلاتے جاتے ۔ ستم ظریفی یہ تھی کہ جو نظمیں چنی گئی تھیں وہ بڑی خوبصورت اور دلچسپ تھیں اور اچھے شاعروں کی لکھی ہوئی تھیں لیکن لڑکوں کا ان کو یاد کرلینا ذرا مشکل کام تھا، چنانچہ وہ بلا سمجھے بوجھے انھیں پڑھ رہے تھے اور اداکاری کرتے جاتے تھے۔ وہ زبردستی یہ ظاہر کررہے تھے گویا بڑی دلچسپی لے رہے ہیں ۔یہی حشر ڈرامے کا تھا۔ اس کے مکالمے تو سبق آموز تھے ۔لیکن وہی سطریں جو بڑی عمر کے لوگوں کے لیے مناسب ہوتیں چھوٹے بچوں کے منہہ سے بالکل ناموزوں لگ رہی تھیں مجھے تو بچوں کے منھ سے وعظ کہلوانا بڑا ہی نامعقول لگ رہا تھا۔ اور مجھے یقین ہے کہ کمشنر صاحب نے بھی یہی محسوس کیا ہوگا۔ وہ چپکے چپکے مزالے رہے تھے اگر ٹیچر لوگ اتنے خوش نہ ہو رہے ہوتے تو مجھے لگتا ہے، انھیں بھی ویسا ہی محسوس ہوتا جیسا مجھے ہو رہا تھا۔

جلسہ ختم ہو گیا۔ کمشنر نے اپنی خوشی کا اظہار کیا اور سب کا شکریہ ادا کیا۔ پھر انعامات بانٹے گئے ۔ایجوکیشن افسر، ہیڈ ماسٹر اور دوسرے سبھی لوگ اس دن کے پروگرام سے مطمئن نظر آرہے تھے ۔ کمشنر صاحب نے جہاں تک میرا خیال ہے، محض لحاظ میں یہ بھی کہا کہ وہ اسکول کے کام سے مطمئن تھے۔

آخر میں ، ایجوکیشن افسر نے کمشنر سے درخواست کی کہ "جناب ، یہ ٹیچر جن کا نام لکشمی رام ہے آپ کو کچھ دکھانا چاہتے ہیں ۔ انھوں نے اس پردے کے پیچھے کچھ پروگرام دکھانے کا انتظام کیا ہے ۔" کمشنر نے رضامندی ظاہر کی تو میں پردے کے پیچھے گیا۔ تیسری گھنٹی بجنے پر پردہ اٹھا اور میری کلاس کے لڑکے میرے دونوں طرف کھڑے نظر آئے ۔ہم نے وہی دعا پڑھی جو ہم روزانہ اپنی کلاس میں پڑھتے تھے۔ کمرے میں مکمل خاموشی تھی ۔لوگ اچانک اس فاضل پروگرام کے دکھائے جانے پر حیران تھے۔

دعا کے بعد ایک چھوٹا سا ڈرامہ "میں دوڑ کر کچہری جاؤں گا" دکھایا گیا۔ ایک لڑکا

چوہا بنا تھا۔ کمر سے ڈوری باندھ کر اس کی دم بنائی گئی تھی وہ اپنے سر پر کالا کپڑا اوڑھے ہوئے تھا اور چاروں ہاتھ پیروں سے چلتے ہوئے چوہے جیسی آواز نکال رہا تھا۔ ایک لڑکا درزی بنا تھا، دوسرا کپڑے پر کڑھائی کرنے والا، تیسرا جوہری، چوتھا نقارچی اور پانچواں راجہ ۔ میں راجہ کا سپاہی تھا۔

ڈرامے کے سبھی کردار اپنے روزانہ کے کپڑوں میں ہی تھے۔ راجہ بڑی شان سے کرسی پر بیٹھے تھے ۔انھوں نے اپنی ٹوپی ذرا ترچھی پہنی تھی ۔ سپاہی ہونے کے ناطے بس نے اپنی مونچھیں مروڑ کر ذرا اونچی کرلی تھیں، اور ایک چھوٹی سی پگڑی باندھ لی تھی۔ میرے ہاتھ میں ایک چاقو تھا۔ نقارچی چھوٹا سا نقارہ لئے ہوئے تھا۔ اور کوئی دوسرا سامان نہیں تھا۔

اسٹیج بڑا سادہ تھا ۔پروگرام بلیک بورڈ پر لکھا ہوا تھا جو پردے کے پیچھے رکھا تھا۔ کمرے کے ایک حصے کو صاف ستھرا کر کے دری بچھادی گئی تھی جو ایک لڑکا اپنے گھر سے لایا تھا ۔ اسٹیج کو سجانے کے لیے اسکول میں کوئی اور دوسری چیز نہیں تھی جسے استعمال کیا جا سکتا۔ دیواروں پر نیم اور پیپل کی کچھ شاخیں کاٹ کر لگادی گئی تھیں ۔زمین پر لڑکوں نے کھریا سے کچھ تصویریں بنا رکھی تھیں۔

بڑوں اور بچوں سبھی نے ڈرامہ خاموشی سے دیکھا۔

چھوٹے لڑکے یعنی طالب علم خاص طور پر دلچسپی لے رہے تھے اور بڑے لوگ کچھ حیران سے تھے ۔ پوچھ رہے تھے " یہ کیا ہے ؟" ارے یہ نئی چیز کیا ہے ؟" یہ کس قسم کا ڈرامہ ہے ؟"

میں کہوں گا کہ بچوں نے ڈرامہ واقعی بہت ہی اچھا کیا۔ انھوں نے کوئی بھی غلطی نہیں کی ۔ پیچھے سے انھیں لقمہ دینے والا کوئی نہیں تھا۔ جب کبھی غلطی ہوجانے کا امکان نظر آتا تو میں سب کے سامنے اسے سدھار دیتا۔ دوسرے ڈرامے کا نام تھا" مجھے جانے دیجئے جناب "اور تیسرے کا۔" خرگوش اور عالی جناب "

پردہ صرف ایک ہی تھا اور سین سینری کا نام تک نہ تھا ۔ بس کبھی کبھار کسی کے ہاتھ میں چھڑی آگئی ، تو کسی نے سر پر کپڑے کا ٹکڑا ڈال لیا ۔ صرف یہی ڈرامے کی پوشاکیں تھیں ۔سارا دارومدار لڑکوں کی ایکٹنگ پر ہی تھا۔

پروگرام دعا کے ساتھ ختم ہوا۔ میں نے آگے بڑھ کر مجمع کو ایسے خطاب کیا جیسے میں پروگرام پیش کرنے والی ٹیم کا منیجر تھا!

میں نے کہا "حضرات! آپ نے جس شوق اور دلچسپی سے ہمارا پروگرام دیکھا اس کا شکریہ۔ میں اس سلسلے میں کچھ کہنا چاہتا ہوں اور درخواست کرتا ہوں کہ آپ توجہ دیں۔"

"یہ چوتھے درجے کے طالب علم ہیں جب ان سے پوچھا گیا کہ کیا وہ اسکول کے جلسے میں کوئی ناٹک پیش کرنا چاہیں گے، تو انھوں نے بڑا جوش و خروش ظاہر کیا۔ فوراً ڈرامے چنے گئے۔ یہ ڈرامے ان کہانیوں پر بنائے گئے جو بچوں نے سنی اور پڑھی ہیں۔ انھیں بتایا گیا کہ یہ ڈرامے بنا کسی تیاری کے کھیلے جائیں گے بالکل اسی طرح جیسے کلاس میں ہوتے ہیں۔ بچوں کو پارٹ زبانی یاد کرنے کو نہیں کہا گیا۔ انھیں کہانی معلوم ہے۔ ہر کردار اپنا کام جانتا ہے اور اسٹیج پر خود بخود موقعہ محل دیکھتے ہوئے اپنا مکالمہ بولتا ہے۔ کوئی چیز زبانی یاد نہیں کرائی گئی۔ سامان اور لباس وغیرہ چیزیں تو دوسرے نمبر پر ہوتی ہیں۔ ہم لوگ چہرے کے اتار چڑھاؤ اور اداکاری پر زیادہ زور دیتے ہیں۔ اگر لباس اور سامان وغیرہ ہٹا لیا جائے تو ڈرامے کے تاثر کا دارومدار تو صرف ایکٹنگ اور بچوں کی اپج پر ہی رہ جاتا ہے جس کی ترقی کا پورا موقعہ ملتا ہے۔ آپ نے یہاں جو کچھ دیکھا اس سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ ہم کس حد تک کامیاب ہوئے ہیں۔ بچوں کو اس طرح کی سرگرمیوں میں بڑا مزا آتا ہے۔ انھیں نہ تو تعریف اور نہ ہی انعام کی ضرورت ہے کیونکہ خوشی اور تشفی پا لینا ہی سب کچھ ہے۔ کام کر لینا ہی اپنی جگہ پوری تشفی حاصل کر لینے کے برابر ہے۔ میں ایک بار پھر آپ سب کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ آپ نے ہمارے بچوں کا پروگرام دیکھنے کی زحمت گوارا کی۔" میں نے اپنی تقریر ختم کر دی۔

کمشنر صاحب خوش معلوم ہوتے تھے۔ میں نے خاصی دیر تک ان کا ردعمل دیکھا تھا۔ اپنی تقریر میں انھوں نے ٹیچر اور طالب علموں دونوں ہی کو مبارکباد دی تھی کہ "انھوں نے آج کی سہ پہر میں صحیح معنوں میں سب کا دل خوش کر دیا ہے"۔ انھوں نے خیال ظاہر کیا کہ کام واقعی شاندار تھا اور پھر انھوں نے اپنے ملک انگلینڈ کے ترقی پسند اسکولوں کا ذکر کیا۔ بولے: "چھوٹے چھوٹے بچوں کو خوشی سے اور بلا تکلف چور، درزی اور بادشاہ کے مختلف کرداروں میں تبدیل ہوتے دیکھنا واقعی بہت ہی پیارا لگا۔ یہی سچی تعلیم ہے۔ چیزوں

کو رٹ لینا اور نظمیں سنا دینا دراصل بیتے دنوں کی باتیں ہیں، جو بھدی اور روح کو کچل دینے والی ہوتی ہیں۔"

وہ چند لمحے رکے اور پھر اپنی بات جاری رکھی۔ "میں پھر کہوں گا کہ یہ سب دیکھ کر مجھے بے انتہا خوشی ہوئی ہے۔ میں بچوں کو انعام نہیں دوں گا۔ اداکاری کرتے وقت جو اصلی خوشی انھیں ملی ہے وہی کسی اور چیز کے مقابلے میں ایک بڑا اور بہتر انعام ہے۔ میں واقعی بے انتہا خوش ہوں۔ بے حد۔ بہت زیادہ خوش!"

جلسہ ختم ہو چکا تھا۔ سب لوگ جا رہے تھے۔ ایجوکیشن افسر بڑے خوش تھے۔ مجھے بلا کر کمشنر صاحب سے میرا تعارف کرایا اور میرے تجربے کے بارے انھیں بتایا۔ کمشنر نے مجھ سے ہاتھ ملاتے ہوئے، میری کامیابی پر مجھے مبارکبادی اور اصرار کیا کہ میں اپنے تجربے جاری رکھوں۔ ان کا خیال تھا کہ اس طرح کے تجربوں کی بڑی قیمت ہے جب کہ پرانے تعلیمی طریقے بڑے کھوکھلے ہیں۔

میں سوچ رہا تھا کہ اس وقت ایجوکیشن افسر کیسا محسوس کر رہے ہوں گے!

میں بہت خوش خوش گھر گیا۔ ظاہر ہے ایک وجہ تو یہ تھی کہ خود کمشنر نے مجھے مبارکباد دی تھی لیکن اصل وجہ یہ تھی کہ میرے تجربے کو سراہا گیا تھا۔ میں نے سوچا: "کمشنر ایک سیاسی افسر ہیں پھر بھی وہ کیسے نئے اسکول اور اس طرح کی باتیں جانتے ہیں؟" بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ کمشنر نے اپنے بیٹے کو یورپ کے ایک ترقی پسند اسکول میں بھیجا تھا اور وہ نئی تعلیم میں دلچسپی رکھتے تھے۔

رات کے وقت دو تین ٹیچر مجھ سے ملنے آئے۔ انھیں یہ جاننے کی بڑی فکر تھی کہ کمشنر صاحب نے مجھ سے کیا کہا تھا۔ چند ہی دنوں کے بعد مجھے ایجوکیشن افسر کا خط ملا کہ میں ان سے مل لوں، چنانچہ میں ان کے گھر گیا۔

ایجوکیشن افسر بڑے اچھے موڈ میں تھے۔ کمشنر اس روز اسکول سے بڑے خوش ہو کر گئے تھے۔ ایجوکیشن افسر نے ایک کرسی میری طرف بڑھائی اور خود آرام کرسی پر بیٹھ گئے۔

انھوں نے کہا "اچھا پہلے یہ بتائیے کہ جو ڈرامے آپ نے پیش کئے انھیں کیا واقعی لڑکوں نے پہلے سے رٹا ہوا نہیں تھا؟"

"کیا آپ نے محسوس کیا کہ انھوں نے ایسا کیا تھا؟"

"نہیں تو۔ لیکن وہ ہر چیز کیسے یاد رکھ سکے؟ ان سب نے ہی اپنے مکالمے بڑی اچھی طرح ادا کئے تھے۔"

"یہی تو اصل نکتہ ہے۔" میں نے کہا۔ "انھیں کہانیاں سنائی گیئں۔ انھوں نے کہانیاں پسند کیں۔ پھر انھوں نے کہانیوں کے کرداروں میں اپنے آپ کو ڈھالا اور ان کے احساسات وجذبات خود محسوس کئے، وہی باتیں وہ اپنے ڈھنگ سے پیش کر رہے تھے جو انھوں نے اپنائی تھیں۔"

"انھیں ایکٹنگ کرنا کس نے سکھایا؟"

"کسی نے بھی انھیں باقاعدہ ہدایت نہیں دی۔ ہم لوگ ہر ہفتے ایک ڈرامہ کھیلتے ہیں۔ میں بھی بچوں کے ساتھ اس میں حصہ لیتا ہوں۔ میں جہاں تک ممکن ہوسکتا ہے اپنا پارٹ ادا کرتا ہوں اور بچے بھی ایسا ہی کرتے ہیں۔"

"یہ کیسے ہوسکتا ہے؟ میں سمجھا نہیں"

میں نے کہا: "وہ اپنی آنکھیں کھلی رکھتے ہیں۔ غور سے دیکھتے ہیں۔ وہ لوگوں کو کھیلتے اور کام کرتے تو دیکھتے ہی ہیں۔ جیسے بڑھئی، کمھار، درزی وغیرہ کو۔ وہ ان لوگوں کو باتیں کرتے سنتے ہیں اور ان کے طور طریقے دیکھتے ہیں۔ جو کہانیاں انھیں سنائی جاتی ہیں ان میں بھی ان لوگوں کے بارے میں بتایا جاتا ہے۔ علاوہ اس کے خدا نے انھیں تخیل بھی عطا کیا ہے۔ بس وہ اپنے تخیل اور تجربے کے میل سے قدرتی طور سے موقعہ پر ہی، اپنا کردار ادا کرلیتے ہیں۔ وہ اپنے تنقید نگار خود ہیں۔ ان کی نظر ہر وقت اس پر رہتی ہے کہ آیا اسٹیج پر وہ اپنے تخیل اور تجربے کو اچھی طرح پیش کر رہے ہیں یا نہیں۔"

"یہ تو کچھ بڑی اونچی اور مشکل بات ہے۔" ایجوکیشن افسر نے کہا۔

"لیکن بچوں کو تو اس کے سمجھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ تو میرا تجزیہ ہے کہ وہ جو کچھ کرتے ہیں کیسے کرلیتے ہیں۔"

"چلئے ٹھیک ہے۔" ایجوکیشن افسر بولے "مگر بھئی آپ نے بڑا اچھا تماشہ دکھایا۔ کمشنر صاحب بہت ہی خوش تھے۔"

میں بولا : "وہ خوش نہ بھی ہوتے تو ڈرامہ تو چلتا ہی رہتا۔"

"آپ نے اس کے بارے میں مجھے کبھی نہیں بتایا! مجھے یقین ہے کہ ہیڈماسٹر صاحب اور دوسرے ٹیچروں کو بھی اس کی کوئی خبر نہیں ہوگی___"

"جی ہاں یہ ٹھیک ہے۔" میں نے کہا۔ "میں نے کسی کو کچھ بھی نہیں بتایا۔ ان لوگوں کا خیال ہے کہ یہ سب وقت کی بربادی ہے۔ وہ لوگ تو چھ ماہی امتحان کی تیاری میں لگے ہوئے ہیں۔"

"لیکن انھیں پتہ تو یقیناً لگ ہی جائے گا؟"

"جی نہیں۔ انھیں خبر نہیں ہوگی۔" میں نے جواب دیا۔ ہر ہفتے ہم جنگلوں پہاڑوں پر گھومنے جاتے ہیں۔ ہم بس مزا لینے کے لیے یہ سب سرگرمیاں وہاں ہی کرتے ہیں۔ میں اپنے ساتھ پلنگ کی ایک چادر لے جاتا ہوں۔ ہم اس کا پردہ بنالیتے ہیں۔ دو لڑکے چادر کا ایک ایک کونہ پکڑ کر الگ الگ تھوڑے فاصلے سے کھڑے ہوجاتے ہیں اور پردہ بن جاتا ہے۔ اداکار اس کے ایک طرف اور تماشہ دیکھنے والے دوسری طرف ہوتے ہیں۔

"واقعی کیا آپ ایسا کرتے ہیں؟"

"جی ہاں، ایسا ہی کرتا ہوں۔"

ایجوکیشن افسر نے کہا۔ "پھر تو ٹھیک ہے۔ ہم اپنے اسکولوں کے سبھی درجوں میں ناٹک کھیلنے کا کام شروع کراسکتے ہیں۔ کمشنر کو پڑھائی کے ایسے طریقے پسند ہیں۔ آپ کے ڈرامے واقعی دلچسپ تھے۔ نظمیں وغیرہ سنانا، ختم کردینے کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟"

"میں نے تو اسے پہلے ہی ختم کر رکھا ہے۔ اگر دوسرے درجوں میں بھی ایسا ہوجائے تو مجھے بڑی خوشی ہوگی۔"

"ہم یقیناً ایسا ہی کریں گے۔ کمشنر اس بات سے اتفاق کرتے ہیں کہ رٹانا پڑھائی کا بالکل ہی بے اثر طریقہ ہے۔ مجھے رٹائی کرنے کا اپنا زمانہ یاد ہے۔ لیکن میں تو کافی ذہین لڑکا تھا اس لئے مجھے کوئی مشکل نہیں پڑتی تھی، لیکن دوسروں کے لئے یہ اچھی خاصی مصیبت تھی ۔ رٹنا۔ لعنت ہو اس رٹائی پر!"

مجھے مزا آرہا تھا۔ اسکول میں کمشنر صاحب کا آنا کافی اچھی بات ہوئی تھی۔ اس سے بھی میرے تجربے کے دوران کچھ حاصل ہوا تو سہی!

II

چھ ماہی امتحان تیزی سے قریب آرہا تھا۔ دوسرے درجوں میں سبق دوہرائے جارہے تھے۔ تاریخ، جغرافیہ، حساب اور مادری زبان کے سبق بار بار رٹ کر یاد کئے جارہے تھے۔ اتنے دن کا جو کورس تھا وہ ایک بار پورا پڑھایا جاچکا تھا، مگر میرے یہاں یہ باقی تھا۔ امتحان کے نقطہ نظر سے میں بہت پیچھے رہ گیا تھا۔ میری کلاس کو بھی چھ ماہی امتحان دینا تھا۔ میں کورس دوہرانے کے لیے وقت دینے کا ارادہ نہیں رکھتا تھا اور وہ وقت میں بچا رہا تھا۔ میری پڑھائی تو آخری دن تک ہونے والی تھی کیونکہ ہم نے کلاس میں جو کچھ بھی کیا تھا لڑکے اسے خود بخود دوہرا رہے تھے۔ میں نے کلاس کا کام کچھ اس طرح کرایا تھا کہ دوہرانے کا کام اسی میں ہو جایا کرتا تھا۔ چنانچہ جب ہم بیت بازی[1] کا کھیل کھیلتے تو ہم نظمیں بار بار دوہرا لیتے تھے۔

میں نے ابھی تک جغرافیہ، سائنس، اور گرامر کو تو چھوا تک نہیں تھا۔ میں نے گرامر پڑھانے کی سوچی۔ اسے ایک مشکل مضمون سمجھا جاتا ہے اور جس میں عموماً دلچسپی نہیں ہوتی۔ تو پھر چوتھے درجے کے لڑکے کیوں اس میں دلچسپی لینے لگے؟ کیا گرامر میں کوئی بات مزیدار ہوتی ہے؟ عمر کی اس منزل میں جب کہ لڑکوں کو اس سے دلچسپی بھی نہ ہو آخر یہ انھیں کیا مفید معلومات دے سکتی ہے؟ ایک طالب علم کو گرامر کیسے دلچسپ اور فائدہ مند معلوم ہوگی؟ میں اس نتیجے پر پہونچا ہوں کہ گرامر صرف بڑی عمر کے طالب علموں کو پڑھائی جانی چاہئے جنھیں زبان کے مطالعے کا شوق پیدا ہو گیا ہو۔ ایسا مضمون پڑھایا ہی

[1] بیت بازی: ایک کھیل جس میں ایک پارٹی کسی نظم کا کوئی بند پڑھتی ہے اور وہ بند جس لفظ پر ختم ہوتا ہے، دوسری پارٹی اس لفظ کے آخری لفظ سے شروع ہونے والا کوئی دوسرا بند سناتی ہے۔

کیوں جائے جس سے بچے اکتا جائیں اور جس کا پڑھانا بھی مشکل ہو؟ سیکھنے کے لیے دوسرے اور بہت سے مضامین ہیں۔

لیکن میں تجربہ کرنے پر تلا ہوا تھا۔ اگر کسی اور وجہ سے نہیں تو اس بنا پر کہ میں وہ شرطیں پوری کرنا چاہتا تھا جن کا میں پابند تھا۔ مجھے لڑکوں کو گرامر کے امتحان کے لیے تیاری کرنا ہی تھا۔

جن نظریاتی اصولوں پر میرا یقین تھا انھیں کی وجہ سے میں گرامر پڑھانا عملاً چھوڑ نہیں سکتا تھا۔ مجھے یہ دکھانا تھا کہ 'درجہ چار میں' 'موجودہ حالات میں'، گرامر کس طرح پڑھائی جاسکتی ہے۔

میں نے گرامر کے نصاب پر ایک نظر ڈالی۔ میں نے محسوس کیا کہ میں اس طریقے سے نہیں کرا سکوں گا جیسا کہ تجویز کیا گیا ہے۔ اسم اور فعل کی تعریف، لیکن یہ تعریف سیکھنے والوں کے لیے کوئی معنی نہیں رکھتی۔ مجھے یاد نہیں آیا کہ کس عمر میں، خود میں نے اسکول میں گرامر پڑھی تھی۔ مجھے صرف الفاظ یاد تھے۔ بہت سے ٹیچر یادداشت کو سوجھ بوجھ سے خلط ملط کر دیتے ہیں۔ میں نے گرامر پڑھانے کے حالیہ طریقے کو خدا حافظ کہا۔ اب گرامر پڑھانے کا نیا طریقہ میں کیا نکال سکتا تھا؟ میں نے ان سوالوں پر کافی غور کیا اور ایک منصوبہ بنایا۔ میں نے لڑکوں کے لئے ایک دلچسپ کھیل تیار کیا اور دو مہینے کے اندر ہی انھوں نے اسم، ضمیر، فعل، اور صفت پہچاننا سیکھ لیا۔ وہ واحد، جمع اور مذکر مونث کا فرق بھی سمجھ گئے۔

ایک دن جب میں فاعل اور مفعول سکھانے جارہا تھا تو ایجوکیشن افسر میرے درجے میں آپہونچے۔ جو کچھ میں کررہا تھا اسے دیکھ کر وہ اچنبھے میں پڑ گئے۔ انھوں نے کہا: "اچھا آپ لڑکوں کو تاش کھیلنا سکھا رہے ہیں! چھ ماہی امتحان سر پر ہیں۔ وقت نہ ضائع کیجئے۔ مہربانی سے جلدی کیجئے اور اپنی پڑھائی جاری رکھئے۔ ہم وقت ضائع نہیں کرسکتے۔ ہم یقیناً تجربے کی کامیابی چاہتے ہیں۔ چاہتے ہیں نا؟"

میں ہلکے سے مسکرایا اور بولا۔ "مجھے یہ بات خوب معلوم ہے۔ کلاس میں کھیل ہو رہا ہے وہ گرامر سکھانے کا ہے۔ کیا آپ لڑکوں کا امتحان لینا چاہیں گے؟"

ایجوکیشن افسر نے لڑکوں سے بات چیت کی اور انھوں نے ان کے سوالوں کے جواب دیئے۔ وہ مطمئن ہو گئے۔ "اوہ۔ لگتا ہے اچھا خاصا کام ہو گیا ہے!"۔ انھوں نے مجھ

سے کہا۔" میں جاننا چاہوں گا کہ آپ نے کیا طریقہ استعمال کیا ہے؟ اگر گرامر اتنے دلچسپ طریقے سے سکھائی جاسکتی ہے تو ہمیں یہ طریقہ تمام درجوں میں شروع کرنا چاہیئے۔" دوسرے دن چھٹی تھی۔ ایجوکیشن افسر نے مجھے اپنے گھر بلا بھیجا تاکہ مجھ سے گرامر سکھانے کا وہ طریقہ جو میں نے استعمال کیا تھا، تفصیل سے معلوم کریں۔

چنانچہ دوسرے دن میں گرامر سکھانے کا اپنا سارا سازوسامان لے کر ایجوکیشن افسر کے گھر گیا اور میں نے ان کو بتایا: جناب گتے کے ان ٹکڑوں پر سکھانے میں مدد کا میرا پہلا سامان ہے۔ میں نے ان کے ایک طرف مذکر اسم اور دوسری طرف مؤنث اسم لکھے ہیں۔ آپ دیکھیں گے کہ ان ٹکڑوں پر مؤنث اسم کی باقاعدہ اور بے قاعدہ دونوں ہی قسمیں لکھی ہیں۔ میں پہلے یہ سارے کارڈ اپنے طالب علموں کو پڑھنے کے لیے دیدیتا ہوں۔ لڑکے انھیں کئی بار پڑھتے ہیں۔ اس طرح وہ مذکر اور مؤنث دونوں ہی طرح کے اسموں سے واقف ہوجاتے ہیں۔ میں نے کارڈوں پر "مذکر جنس" اور "مؤنث جنس" کا عنوان بھی دیدیا ہے اس لیے ان کا دھیان اسی پر جاتا ہے کہ اس کی قسم کیا ہے۔ مذکر یا مؤنث، اسم کی ان دو قسموں سے میں نے انھیں شروع میں اسی طرح آگاہ کیا۔

ایک دن میں نے ان سے اسم "بیل" کا مؤنث پوچھا تو انھوں نے جواب دیا:
" گائے "اب مجھے شیر کا مونث بتاؤ؟"
جواب ملا "شیرنی"

"لڑکا" "لڑکی"
"مرد" "عورت"
"کتا" "کتیا"
"مرغا" "مرغی"

اسی طرح سوال جواب چلتا رہا۔ میرا منصوبہ کامیاب رہا تھا۔ میں نے جس طرح شروعات کی اس سے انھیں ایک اندازہ ہو گیا۔

پھر میں نے ایک کھیل شروع کیا۔ میں بلیک بورڈ پر کوئی مذکر اسم لکھ دیتا اور لڑکے اس کا مؤنث لکھتے۔ میرے کہنے پر انھوں نے بڑی اچھی طرح عمل کیا۔ جب میں نے ان کی فہرستیں دیکھیں تو بہت کم غلطیاں تھیں اور غلطی کرنے والے طالب علموں کی تعداد

بہت تھوڑی تھی۔

تب میں نے ایک دوسرا کھیل شروع کیا۔ میں نے انھیں دو ڈبے دیئے اور بتایا کہ ایک میں مذکر اور دوسرے میں مؤنث اسم کے کارڈ ہیں۔ ہر لڑکے کو ایک مذکر اسم کے مقابل دوسرے ڈبے میں سے مؤنث اسم کا کارڈ اٹھانا ہے۔ لڑکے گھنٹوں بلا اکتائے اور بغیر الجھن کے یہ کھیل کھیلتے رہے۔

"لیکن ڈبے کی صرف ایک جوڑی سے سارے لڑکے کیسے کھیل پائے؟" ایجوکیشن افسر نے پوچھا۔

"مجھے اس کے لیے کوئی راستہ تو نکالنا ہی تھا۔" میں نے کہا۔ "میں نے کلاس میں دونوں طرف دس دس گول دائرے کھینچے۔ ایک طرف کے دائروں میں مذکر اسم کے اور دوسری طرف کے دائروں میں مؤنث اسم کے کارڈ رکھ دئیے گئے۔ ہر لڑکے کو ایک ایک دائرہ دے دیا گیا۔ اب ایک طرف کا لڑکا اپنے دائرے سے ایک کارڈ اٹھا کر اس کے جوڑ کا اسم دوسری طرف کے کارڈوں میں تلاش کرتا اور ملنے پر اپنا کارڈ چھوڑ دیتا۔ جب سارے کارڈوں کے جوڑ کے اسم مل جاتے تو کھیل ختم ہوجاتا۔ اسی طرح پھر سے یہ کھیل ہوتا۔ اگر دو ہی لڑکے کھیل رہے ہوتے تو وہ ایک ایک ڈبہ لے لیتے اور مذکر سے مؤنث کا جوڑ ملانے کی کوشش کرتے۔"

"کافی دلچسپ ہے۔" ایجوکیشن افسر بولے۔ "لیکن آپ نے بے جنس اسم کیسے سکھایا؟"

"جب لڑکے مذکر اور مونث سے بخوبی واقف ہوگئے تو میں نے الفاظ 'کرسی، میز، قلم، جھاڑن وغیرہ بلیک بورڈ پر لکھے اوپر "بے جنس اسم" کا عنوان لکھ دیا۔ لڑکوں نے سب لفظ پڑھے اور حیران تھے کہ یہ کس قسم کے اسم ہیں!

"وہ اب تک حاصل کی ہوئی سمجھ بوجھ کی بنیاد پر کچھ فیصلہ نہ کرسکے تب میں نے بتایا کہ اس طرح کے الفاظ "بے جنس" کہے جاتے ہیں، میں نے ایک بار پھر بلیک بورڈ پر "بے جنس" لکھ دیا۔

ایک لڑکے نے پوچھا: "بے جنس کا کیا مطلب ہوتا ہے؟"
"میں نے کہا جو اسم نہ مذکر ہو نہ مؤنث وہ بے جنس اسم کہلاتا ہے۔"

ایسا لگا کہ وہ سمجھ رہے ہیں۔ میں نے ان سے سلیٹ پر تین کالم بنانے کو کہا ۔ ایک اسم مذکر لکھنے کے لیے دوسرا اسم مؤنث لکھنے کے لیے اور تیسرا بے جنس اسم لکھنے کے لیے ۔ میں نے ساٹھ الفاظ لکھوائے اور کہا کہ وہ لوگ ان الفاظ کو ان کے مناسب کالم میں لکھیں ۔حیرانی کی بات ہے کہ ہماری اکثریت نے مشکل سے ہی کوئی غلطی کی ۔تب میں نے نتیجہ نکالا کہ لڑکوں کو پہلے تعریف یاد کرانے کے بجائے الفاظ سے واقف کرادینا زیادہ بہتر ثابت ہوتا ہے ۔یہ کھیل کے ذریعے ہی کرانا اچھا ہوگا۔اصول اور تعریف رفتہ رفتہ بعد میں بتائی جاسکتی ہے ۔"

"جنس معلوم کرنے کے لیے تو آپ لڑکوں سے یہ پوچھ سکتے تھے کہ وہ ان کا پتہ چلانے کے لیے "نر" یا "مادہ" یا "یہ" کیا ضمیر استعمال کرتے ہیں؟" ایجوکیشن افسر نے کہا

" وہ تو بس ایک موٹا طریقہ ہوتا۔ بلا سمجھے بوجھے رٹنے والی بات ہوجاتی ۔اب جب کہ وہ مفہوم سمجھ گئے ہیں، انھیں پتہ چلانے کا یہ طریقہ بس تفریح کی غرض سے بتایا جاسکتا ہے ۔"

"بہت خوب !" ایجوکیشن افسر گہری دلچسپی لے رہے تھے ۔

"پھر آپ نے کیا کیا؟" انھوں نے پوچھا۔

"پھر میں نے اسی طرح واحد اور جمع کا صیغہ سکھایا۔"

"تو آپ نے اس کے لیے بھی کوئی کھیل نکالا؟"

"جی ہاں جس لڑکے کے پاس واحد اسم کا کارڈ ہوتا وہ اس کی جمع کا کارڈ تلاش کرکے جوڑی بناتا۔"

"میں سمجھا ! لیکن آپ نے اسم اور فعل وغیرہ کیسے سکھائے؟"

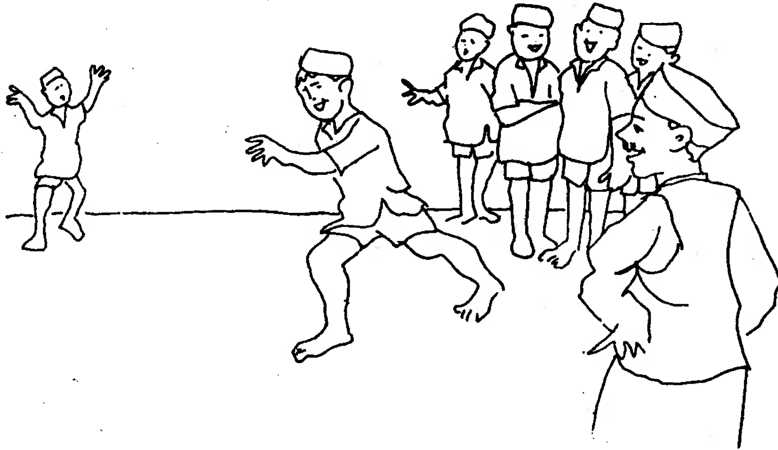
"جی میں نے فعل پہلے سکھایا ۔میرے شاگرد پڑھنا جانتے ہی تھے ۔میں نے ان سے کہا کہ جو کچھ میں بلیک بورڈ پر لکھوں اس کے مطابق انھیں کرنا ہوگا۔چنانچہ میں ایک لفظ لکھتا کہ انھیں کیا کرنا ہے ۔ انھیں اسی کے مطابق عمل کرنا ہوتا ۔جس لڑکے کا نام میں پکارتا وہی اس کام کو کرتا ۔میں نے بلیک بورڈ پر لفظ "کھڑا ہونا" لکھا ۔ پھر بیٹھنا، دوڑنا، چلنا ،ناچنا، پڑھنا، بولنا، کھیلنا، گرنا، کودنا، اور جھولنا وغیرہ الفاظ لکھے ۔

"بچوں کو یہ آسان کام کرنے میں مزا آیا۔انھوں نے ایسے اور بھی الفاظ لکھنے کی

فرمائش کی ۔میں ایسے الفاظ لکھتا رہا اور وہ کرکے دکھاتے رہے ۔

دوسرے دن میں نے بیٹھنا، دوڑنا، کھڑا ہونا وغیرہ الفاظ ایک کارڈ پر لکھے اور انھیں نام دیا : "کچھ فعل" لڑکوں نے پڑھا۔اس کے دوسرے روز میں ایک ڈبہ لایا جس پر لکھا تھا : " فعل کا ڈبہ "۔بچوں نے ڈبہ کھول کر وہ کارڈ نکالے جن پر میں نے چند الفاظ لکھ دئیے تھے ۔ کارڈ پر الفاظ کے مطابق انھیں کام کرنا تھا۔لڑکے کارڈ پر لکھے لفظوں کے مطابق ناچے کودے، دوڑے اور گرے ۔تب میں نے ان سے کہا کہ وہ خود سوچ کر کچھ ایسے ہی فعل کے الفاظ لکھیں تو انھوں نے کئی نئے فعل لکھے ۔ تب میں نے نیا کھیل شروع کیا ۔ میں نے ان سے کہا کہ میں ایک لڑکے سے کچھ کرنے کو کہوں گا۔اسے بتانا ہوگا کہ اس نے کیا کام کیا اور پھر ایک بورڈ پر اسے لکھنا ہوگا۔میں نے جگجیون سے دوڑنے کو کہا۔وہ دوڑا۔ میں نے لڑکوں سے پوچھا : "جگجیون کیا کررہا ہے ۔" انھوں نے کہا: "وہ دوڑ رہا ہے۔"

اس کے بعد میں نے ایک ایک کرکے ان سے کودنے، لکھنے، پڑھنے وغیرہ کے لیے کہا اور دوسرے لڑکوں سے کہا کہ جو کام کیا جارہا ہے وہ اسے بلیک بورڈ پر لکھتے جائیں ۔ جب میں نے بلیک بورڈ پر نظر دوڑائی تو زیادہ تر لڑکوں نے فعل صحیح لکھے تھے، البتہ ایک دو نے جو اچھی طرح سمجھ نہیں پائے تھے غلطیاں کی تھیں ۔



پھر میں نے کچھ لڑکوں کو دوڑو، کودو، لکھو، پڑھو وغیرہ حکم دیے۔

اسی طرح جاری رکھتے ہوئے، میں نے لڑکوں سے کہا کہ وہ کوئی کام کریں اور بلیک بورڈ پر لکھیں کہ انھوں نے کیا کام کیا۔ میں نے جگجیون سے دوڑنے کو کہا وہ دوڑا اور اس نے بورڈ پر لکھا " دوڑا " ۔ ہم اسی طرح کھیل جاری رکھا۔ میں نے ان کا حوصلہ بڑھایا کہ وہ اپنے آپ کھیلیں اور لفظ لکھیں۔ انھوں نے کافی دلچسپی دکھائی۔

ایک دن میں نے کلاس کو بتایا کہ " رام جی جب دوڑتا ہے تو وہ دوڑنے کا کام کرتا ہے۔ اچھا بتاؤ جب شام جی لکھتا ہے تو کیا کام ہوتا ہے؟" "لکھنا۔" انھوں نے جواب دیا۔

میں نے ان سے اسی طرح کے سوالات کچھ دوسرے فعل استعمال کر کے پوچھے۔ پھر میں نے بلیک بورڈ پر الفاظ " دوڑتا ہے"____ دوڑا، لکھتا ہے___ لکھا، ٹہلتا ہے ٹہلا وغیرہ لکھے۔ میں نے سمجھایا کہ یہ سارے "فعل " ہیں۔ ہر لفظ کوئی کام بتاتا ہے۔ لڑکے سمجھ گئے۔"

"پھر ___؟" ایجوکیشن افسر نے پوچھا۔

میں نے لڑکوں سے کہا کہ وہ جتنے لفظ فعل کے دے سکیں مجھے لکھ کر دیں۔ انھوں نے ، فعل ، لکھے اور ان کی سلیٹیں بھر گئیں۔ تب میں نے ایک اور کھیل نکالا۔ میں نے بورڈ پر ایک جملہ لکھا :

رام جی دوڑتا ہے اور چمپک پڑھتا ہے

میں نے لڑکوں سے کہا وہ جملے میں فعل کو رہنے دیں اور بقیہ لفظ مٹا دیں۔ لڑکوں نے یہ کام بالکل صحیح کیا۔ پھر میں نے فعل سکھانے کا کام اس منزل پر چھوڑ دیا"

ایجوکیشن افسر نے کہا : "میں مانتا ہوں کہ اس طریقے سے لڑکے سیکھ ضرور لیں گے مگر اس میں بڑا وقت لگے گا۔ انھیں کافی دیر تک اس طرح کے کھیل کھیلنے پڑیں گے۔"

" کھیل میں ہی تو مزا آتا ہے۔ کیا یہ بہتر نہیں کہ کارآمد نتیجہ حاصل کرنے کی خاطر کچھ زیادہ وقت صرف کیا جائے بجائے اس کے کہ وقت بچایا جائے اور پھر نتیجہ خراب ہو؟ اس سے تو آخر میں یہی ہوگا کہ صرف کیا گیا سارا ہی وقت برباد ہو جائے گا۔"

"ٹھیک ہے۔" ایجوکیشن افسر بولے۔ "آپ نے "اسم " کے بارے میں کیا کیا؟"

"معمول کے مطابق میں نے کارڈوں پر کچھ اسم لکھ کر درجے میں انھیں لٹکا دیا۔

لڑکے کارڈ پر سے انھیں بار بار پڑھتے رہے۔ میں نے ہر قسم کے اسم اکٹھا کئے تھے اور قسم کے لحاظ سے ان لفظوں کو الگ الگ گروپوں میں بانٹ دیا تھا۔ چنانچہ لڑکوں کے لیے اسموں کا پڑھنا ایک دلچسپ مشغلہ ہو گیا۔ میں چاہتا تھا کہ لڑکے بغیر میرے باقاعدہ سکھائے ہی سیکھ جائیں۔ اب لڑکے کارڈوں پر لکھے اسم اور فعل کے الفاظ کا فرق بڑی اچھی طرح جان گئے تھے۔ وہ ان دو گروپوں کے الفاظ کو پہچاننے میں بڑی پھرتی دکھانے لگے تھے۔

"ایک دن میں نے ان سے کہا : "میرے لئے لاؤ "۔ میں نے یہ نہیں بتایا کہ کیا۔۔ "میرے لیے ایسی چیز لاؤ جس کا کوئی نام ہو۔ اس چیز سے پوچھو کہ اس کا نام کیا ہے؟ اگر اس کا کوئی نام ہو تو لے آؤ۔"

"لڑکے بات سمجھ گئے۔ وہ بلیک بورڈ کی طرف گئے اور سوال کیا" تمھارا کیا نام ہے؟" اور پھر خود ہی جواب دیا۔ "بلیک بورڈ"۔ تب وہ بلیک بورڈ اٹھا لائے۔ اس طرح وہ جھاڑن چھڑی، کتاب، سلیٹ، قلم اور ڈبہ، جس چیز کا بھی نام بتا سکتے تھے لے آئے۔ ایک لڑکا پاس کے درجے سے ایک طالب علم کو پکڑ لایا۔

"یہ کیا ہے؟"

"اس کا ایک نام ہے۔" لڑکے نے جواب دیا۔

"میں سورج کو کیسے لاؤں؟" ایک لڑکے نے سوال کیا۔

"میں پیڑ کو تولا نہیں سکتا۔" دوسرے نے شکایت کی۔

"میں نے اندازہ لگا لیا کہ "اسم" کا بنیادی مطلب تو وہ سمجھ گئے ہیں۔ پھر میں ایک ڈبہ لایا جس میں پرچیوں پر میں نے "اسم" لکھ رکھے تھے۔ کوئی نام یا "اسم" ___ لڑکے اس طرح کا کھیل کھیلنے کے عادی ہو چکے تھے۔ انھوں نے مٹھی بھر پرچیاں جلدی سے نکالیں اور ان پر لکھے اسم پڑھنے لگے۔ میں نے ہر طرح کے اسم لکھ رکھے تھے۔ ایک لڑکے نے سوال کیا۔ "یہ لفظ "ہرا پن" اسم کیسے ہو گیا؟"

"میں نے اسے ایک پتی دکھائی اور اس سے سوال کیا کہ ہم لوگ اس رنگ کو کیا نام دیں گے؟ لڑکا مسکرا کر چلا گیا۔

"میں نے اسم اور فعل کی پرچیاں ملا دیں اور لڑکوں سے کہا کہ وہ الگ کریں۔ ایک جگہ "اسم" ہو دوسری جگہ "فعل" ___ یہ کھیل بڑی اچھی طرح چلتا رہا۔ لڑکوں نے "فعل"

اور "اسم" سمجھ جانے کا اطمینان بخش مظاہرہ کیا۔

"تب میں نے ایک اور کھیل شروع کیا۔ اب میں نے ان سے کہا کہ وہ مجھے ایک "اسم" بتائیں جو ایک دیئے ہوئے فعل کے ساتھ جائے اور ایک ایسا فعل بتائیں جو دیئے ہوئے اسم کے ساتھ جائے۔ مثلاً اگر اسم گھوڑا دیا ہو تو دوڑتا ہے یا دوڑا فعل کے ساتھ جائے گا اور اگر دیا ہوا فعل پڑھتا ہے ہو، تو پھر اس کے ساتھ اسم مان لیجئے لڑکا ہو گا۔ میں نے انھیں دکھایا کہ الفاظ کو کیسے ترتیب دینا ہو گا۔ یہ کھیل بھی اچھا رہا۔

"اس کے بعد میں نے بلیک بورڈ پر چند جملے لکھے اور لڑکوں سے کہا کہ وہ سلیٹ پر ان جملوں کے فعل اور اسم الگ الگ لکھیں۔ نیا پن لانے کے لیے میں ان سے کہتا کہ "اچھا اب بورڈ پر لکھے جملوں میں اسم اور فعل مٹا دوں۔ یا اب اسم اور فعل بول کر بتاؤ۔ اس طرح لڑکے اسم اور فعل کی مناسبت سے ان کا جوڑ ملانے لگے۔"

"آپ ٹھیک کہتے ہیں!" ایجوکیشن افسر بولے۔ واقعی لڑکوں کو تو سب کافی آسان لگا ہو گا لیکن پڑھائی میں مدد کے لیے سامان حاصل کرنے پر تو آپ کا خرچہ آیا ہو گا؟ اصل میں آپ جیسی گہری سوجھ بوجھ ہونی چاہیئے"۔

"اگر بچے رٹائی کرنے سے بچ سکیں تو تھوڑا بہت پیسہ خرچ کر دینا کوئی بڑی بات نہیں۔ میں نے اپنا تھوڑا پیسہ خرچ کیا ہے۔ میرے پاس پرانے گتے پڑے تھے وہ میں نے ڈبے بنانے میں استعمال کر لئے اور پرانے کاغذوں کی پرچیاں بنا لیں۔"

"میں کوشش کروں گا کہ یہ رقم آپ کو واپس مل جائے۔" ایجوکیشن افسر نے کہا۔

"جی رقم واپس دلانے کے بجائے اگر آپ میرے پڑھانے کے طریقے کو قبول کر لیں تو زیادہ بہتر ہو گا۔"

"اچھا ہم اس پر غور کریں گے۔ اب یہ بتائیے، اس کے بعد آپ نے کیا کیا؟"

"میں نے صفت سکھانا شروع کیا۔ امید ہے جناب آپ اکتا نہیں رہے ہوں گے ویسے گرامر خاصا غیر دلچسپ مضمون ہے۔ اور اوپر سے میری عادت ہر چیز بڑی تفصیل سے بتانے کی بھی ہے۔" میں نے کہا۔

"تفصیل بتانے میں تو کوئی حرج نہیں۔ جب تک آپ تفصیلات نہیں بتائیں گے

مجھے پوری بات کیسے معلوم ہو گی؟ انہوں نے جواب دیا۔ پھر بولے۔ "اچھا اس سے پہلے کہ آپ پھر بتانا شروع کر دیں، تھوڑی چائے پی لی جائے۔"

ایجوکیشن افسر اچھی چائے کا ذوق رکھتے تھے۔ ان کے پاس عمدہ قسم کی چائے کا اسٹاک ہوا کرتا تھا اور وہ جانتے تھے کہ مجھے بھی اچھی چائے کا شوق ہے۔ ہم نے چائے پینے میں کوئی بیس منٹ لگائے۔ چائے نے ہمیں تازہ دم کر دیا اور موڈ بھی بڑا اچھا ہو گیا۔ ہم نے اپنی بات چیت پھر شروع کر دی۔

"میں نے معمول کی طرح لڑکوں کو کارڈ دیئے جن پر اب صفت کے الفاظ لکھے تھے۔ میں نے صفت کے بہت سے الفاظ لکھ دیئے تھے اور لڑکوں نے بڑی دلچسپی دکھائی۔ انہوں نے صفت کے الفاظ پڑھے۔ ایک لڑکے نے پوچھا: "جناب! صفت لفظ کا مطلب کیا ہوتا ہے؟"

میں نے کہا۔ "تم خود ہی پتہ چلاؤ۔ یہ سارے الفاظ صفت ہیں"۔ رفتہ رفتہ وہ سمجھنے لگے۔ میں نے کھیل جاری رکھا۔ اب وہ ان کارڈوں کو پڑھ کر اسم، فعل اور صفت کے کارڈ چھانٹنے لگے۔

پھر میں نے ایک اور کھیل سوچا۔ میں نے لڑکوں سے کہا "میں جو مانگوں مجھے لا کر دو ـــــ ایک پنسل لاؤ۔"

ایک لڑکا پنسل لایا۔

"مجھے لال پنسل دو۔" مجھے ایک لال پنسل دی گئی۔

"مجھے نیلی پنسل دو۔" نیلی پنسل لائی گئی

"پنسل لے جاؤ۔"

"کونسی؟" لڑکے نے پوچھا

"لال والی۔" میں نے جواب دیا۔

ایک ایک کر کے میں نے نیلا، پیلا، لمبا، چھوٹا، وغیرہ الفاظ استعمال کئے۔

"ایک پنسل اٹھاؤ۔"

ایک لڑکے نے پنسل اٹھائی۔

"اب ایک ہری پنسل اٹھاؤ۔"

"پیلی پنسل اٹھاؤ۔"

"لمبی والی اٹھاؤ۔"

اسی طرح چلتا رہا۔ پھر میں نے پوچھا: "تم نے کونسی پنسل اٹھائی ؟"

"پیلی والی۔"

"اور تم نے ؟"

"لمبی والی ۔"

میں نے بلیک بورڈ پر لکھا:

یہ الفاظ جو صفت کہلاتے ہیں کسی چیز کے بارے میں کوئی خاص بات، کوئی خصوصیت بتاتے ہیں۔

اب میں نے اسم اور صفت کے ڈبے اٹھائے اور بچوں سے کہا کہ وہ کسی اسم کے ساتھ جانے والا صفت کا کارڈ نکالیں یا صفت کے ساتھ جانے والے اسم کا۔ ایک لڑکے نے صفت "لال" کا کارڈ نکالا اور اس کے ساتھ جانے کے لئے اسم "گھوڑے" کا۔ دوسروں نے بھی اسی طرح جوڑی بنانا شروع کیا۔ میں دیکھتا رہا۔ کبھی کبھی جوڑی غلط بن جاتی تھی۔

میں نے اپنے طور پر لڑکوں کو جانچا۔ صفت کا مطلب ان کی سمجھ میں آگیا تھا اس لئے وہ ناموں کی مناسبت سے اسم اور صفت پہچاننے لگے تھے۔"

"آپ نے تو بڑا ہی دلچسپ کھیل نکالا" - ایجوکیشن افسر نے کہا اسم، فعل، اور صفت کی شروعات تو بڑی اچھی رہی۔ اب ان کی تعریف بتانے کی بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟"

تعریف کا پہلو تو اسی میں موجود ہے۔ بہر حال میں کتاب میں لکھی رسمی تعریف انھیں نہیں بتاؤں گا اور میرا خیال ہے کہ آپ امتحان میں ان سے باقاعدہ تعریف نہ پوچھیں۔ بجائے اس کے آپ ان سے جملے بنانے کو کہیں۔"

ایجوکیشن افسر بولے: "میں تو آپ کے لڑکوں کا گرامر میں امتحان لینا ہی نہیں چاہتا۔ میں پڑھانے کا یہ طریقہ سارے اسکول میں شروع کرانا چاہتا ہوں۔ گرامر کے قاعدے رٹ کر یاد کرنے میں لڑکوں کو بڑی مشکل پیش آتی ہے۔"

"جناب! اسکول میں گرامر سیکھتے ہوئے میری جتنی پٹائی ہوئی تھی اس کی وجہ

سے آج تک پیٹھ میں درد ہوتا ہے۔ ہمارے ٹیچر، ہمیں اس وقت خوب مارتے تھے جب ہم ان کی مرضی کا جواب نہ دے پاتے"۔

"انھوں نے تو بچوں کو پیٹنا آج تک بند نہیں کیا ہے۔" ایجوکیشن افسر بولے

"پھر آپ کیوں نہیں اسے بند کرا دیتے؟"

"یہ صرف میرے ہاتھ میں تو ہے نہیں۔ شاید کسی حد تک ہو بھی۔ لیکن میں سوچتا ہوں اس مسئلے کو چھوڑیئے۔ اگر ہم اچھی طرح پڑھائیں تو جسمانی سزا تو خود بخود ہی ختم ہو جائے گی۔ آپ اپنی بات کو لیجئے۔ گرامر پڑھاتے ہوئے آپکو تو کسی کو مارنے پیٹنے کی ضرورت نہیں پڑی اچھا اب ضمیر سکھانے کے اپنے طریقے کے بارے میں کچھ بتایئے"۔

اس میں تو کوئی نئی بات نہیں ہے۔ یہ بڑا آسان کھیل تھا۔ میں نے لڑکوں سے پوچھا: "میں کون ہوں؟"

انھوں نے کہا: "لکشمی شنکر جی۔"

"تم کون ہو؟"

"شام جی ۔"

"وہ کون ہے؟"

"دھن جے ۔"

تب میں نے بورڈ پر لکھا۔

میں ——— لکشمی شنکر

تم ——— شام جی

وہ ——— دھن جے

ہم ——— لکشمی شنکر، شیام سندر، دھن جے، بھیا شنکر۔

تم لوگ ——— ریوارام، لکشمن سنگھ، ٹیکم سنگھ، دیوی پرساد۔

وے ——— تیسرے درجے کے لڑکے۔ سوہن سنگھ، مولچند، موہن سنگھ، لکھی چند، روپ سنگھ۔

میں نے بلیک بورڈ پر جو کچھ لکھا تھا لڑکوں نے نقل کر لیا۔ تب میں نے انھیں بتایا کہ میں، تم، وہ، ہم، وے، وغیرہ الفاظ ضمیر کہلاتے ہیں۔

ایک دن ایک لڑکے نے سوال کیا "ضمیر کیا ہوتا ہے جناب؟"

میں نے کہا: "تم اس کے بارے میں خود ہی سوچو۔"

لوجی نام کا لڑکا بولا: "جناب! میرا کا مطلب ہے 'لوجی کا' اور تمہارا کا مطلب ہے 'لکشمی رام جی کا' ہے نا؟"

تیسرا لڑکا بولا: "تب میرا، تمھارا، اس کا یہ سب لفظ بھی ضمیر ہونے چاہئیں۔"

"بالکل درست ہے" میں نے کہا۔

ایک لڑکا پھر بھی مصر رہا: "لیکن ضمیر ہوتا کیا ہے؟"

میں نے بلیک بورڈ پر لکھا: "رام جی کے پاس ایک سلیٹ ہے۔"

"رام جی کے پاس ایک قلم ہے۔"

"رام جی برہمن ہے۔"

"رام جی اسکول جاتا ہے۔"

"رام جی روزانہ سویرے اسکول آتا ہے۔"

"لکشمی رام تمھارے ٹیچر ہوں گے۔"

"لکشمی رام تمھیں پڑھائیں گے۔"

"لکشمی رام تمھیں باہر سیر کرانے لے جائیں گے۔"

لڑکوں نے یہ سارے جملے پڑھے۔ پھر میں نے دوسرے جملے سے آگے تک کے جملوں سے "رام جی" مٹا کر "وہ" اور لکشمی رام مٹا کر "میں" لکھ دیا۔

لڑکوں نے یہ جملے پھر سے پڑھے۔ ایسا لگا جیسے وہ سمجھ رہے ہوں۔ میں نے سوال کیا: "اچھا بتاؤ میں "ضمیر" کہاں استعمال کروں؟"

"رام جی کی جگہ" کچھ لڑکے بولے "لکشمی رام کی جگہ۔"

"رام جی اور لکشمی رام الفاظ کیا ہیں؟ اسم یا فعل؟"

"اسم"

"تو بتاؤ اسم کی جگہ کیا لاتے ہیں؟"

"ضمیر"

ایجوکیشن افسر ہنس پڑے بولے: "بھئی آپ تو خوب ہی ٹیچر معلوم ہوتے ہیں۔

ہر چیز خاصی تفصیل سے بتاتے ہیں۔"

"جی۔ ٹیچر بننے سے بچ کیسے سکتا ہوں، ہاں اگر ایک وکیل ہوتا تو البتہ مختصر بات کر سکتا تھا۔"

ایجوکیشن افسر دلچسپی تو لے رہے تھے لیکن اب وہ تھک چکے تھے لہٰذا میں نے ان سے اجازت مانگی۔

انھوں نے کہا: میں سوچتا ہوں کہ آپ کی کلاس کو گرامر کے امتحان سے چھوڑ دوں۔ ابھی آپ کو صیغے وغیرہ سکھانا باقی ہے۔ مہربانی سے جب آپ سکھانا شروع کریں تو مجھے ضرور بتائیے گا۔ گرامر سکھانے کے بارے میں اگلے سال میں کچھ کرنا چاہتا ہوں۔"

میں انھیں سلام کرکے گھر لوٹا، اور بستر پر لیٹ گیا۔ میں بری طرح تھکا ہوا تھا۔

III

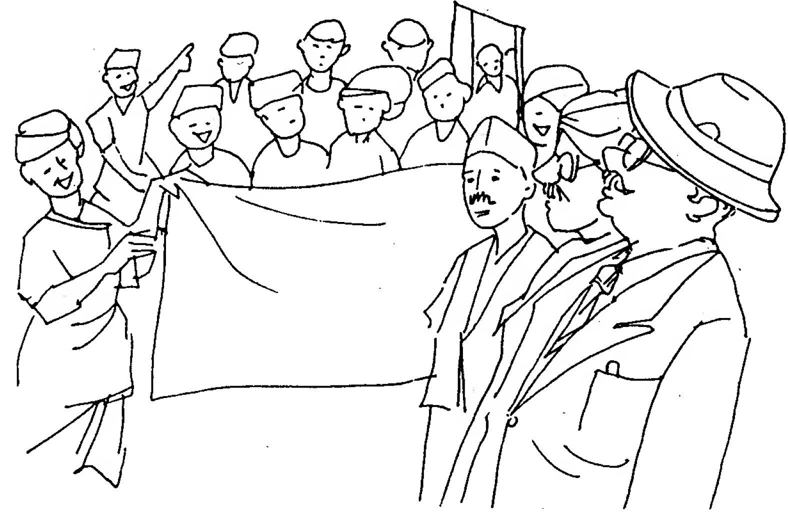
چھ ماہی امتحان اور قریب آگئے۔ ایجوکیشن افسر امتحان لینے آرہے تھے۔ انھیں ممتحن بن کر کام کرنا اچھا لگتا تھا۔

میں نے اپنے طریقے سے اپنی کلاس کو تیار کر رکھا تھا۔ میں نے ایجوکیشن افسر کو پہلے سے بتادیا تھا کہ جب تمام درجوں کے امتحان ختم ہوجائیں تب میری کلاس کا امتحان لیجئے گا۔ میں چاہتا تھا کہ دوسرے تمام ٹیچر اور ہیڈ ماسٹر صاحب میری کلاس کے امتحان کے وقت وہاں موجود ہوں۔ میں نے یہ بھی تجویز کیا تھا کہ جب میری کلاس کے امتحان ہورہے ہوں تو ہر درجے کے پانچ لڑکوں کو بھی وہاں رہنے کی اجازت دی جائے۔

امتحان کے دن میں بڑا پرسکون اور مطمئن تھا۔ میرے ذہن میں کوئی تناؤ نہیں تھا۔ میں لڑکوں کے فیل یا پاس ہونے کے بارے میں بالکل پریشان نہیں تھا۔ میں نے لڑکوں سے کہدیا تھا: "تم لوگ بالکل ویسے ہی کروگے جیسے کہ ہر روز اپنی کلاس میں کرتے ہو۔ تم لوگ یقیناً پاس ہو جاؤ گے لیکن ہم دوسروں کو یہ دکھانا چاہتے ہیں کہ ہم اب تک کیا کرتے

رہے ہیں۔"

جیسا کہ میرا طریقہ تھا میں نے سب انتظام ایک پردے کی پیچھے کر رکھا تھا۔ سب لوگ پردے کے سامنے بیٹھے ہوئے تھے۔ تب میں نے پردہ اٹھا دیا۔ وہاں دوسرے درجوں کے لڑکے الگ الگ گروپوں میں بیٹھے ہوئے تھے اور ہر گروپ کو میری کلاس کا ایک طالب علم کوئی کہانی سنا رہا تھا۔ کہانی سنانے کا کام پورے زور و شور سے جاری تھا۔ ہر لڑکے نے اپنی پسند کی کہانی چنی تھی۔ لڑکوں نے کہانی کی کتابیں پاس ہی رکھ لی تھیں کہ اگر کہیں کچھ بھول جائیں تو دیکھ لیں۔ ہر بچہ اپنے انداز میں کہانی سنا رہا تھا اور سننے والوں کے ساتھ اس کا لطف اٹھا رہا تھا۔ ہر لڑکا کہانی سنانے کی تکنیک جانتا تھا۔ کہانیاں مناسب لہجے، چہرے کے اتار چڑھاؤ اور اشاروں سے سنائی جا رہی تھیں۔ سننے والے محو تھے اور ٹیچر بس حیران ہو کر دیکھ رہے تھے!



اپنے ناٹکی راج کے مطابق میں نے سارا انتظام پردے کی اوٹ میں ہی کیا۔

میں نے کہا: "یہ میری کلاس کا ایک امتحان ہے۔"

ایک ٹیچر بولے: "آخر کس چیز کا امتحان ہے؟"

"زبان پر عبور حاصل کرنے کا، بیان کرنے کی صلاحیت کا، اور یاد داشت اور اداکاری کا۔" میں نے جواب دیا۔ ٹیچر لوگ اگلے امتحان کے بےچینی سے منتظر تھے۔

پردہ پھر اٹھایا گیا۔ اب لڑکے ایک گھیرا بنائے بیٹھے تھے۔ بلیک بورڈ پر دو پروگرام لکھے تھے۔ پہلا، بیت بازی کا پروگرام تھا۔ ایک لڑکے نے کسی نظم کا بند پڑھا تو دوسرے نے اس کے جواب میں کوئی ایسا بند پڑھا جس کا پہلا لفظ اس حرف سے شروع ہوتا تھا جس پر پہلے لڑکے کا بند ختم ہوا تھا۔ کھیل اس وقت تک جاری رہا جب تک کہ گھیرے کے سب لڑکوں کی باری نہیں آ گئی۔ تب کھیل دوبارہ کھیلا جانے لگا۔

"آپ نے لڑکوں کو دو ٹیموں میں کیوں نہیں بانٹا؟ دو ٹیمیں تو ہونی چاہئیں۔"

"نہیں جناب!" میں نے کہا "میں نے جان کر ایسا نہیں کیا ہے ٹیموں کے درمیان میچ ہار اور جیت پر ختم ہوتا ہے۔ اس سے مقابلے اور حسد کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ میرا طریقہ یہ ہے کہ اگر کوئی لڑکا بند نہ سنا سکے تو پھر دوسرا کوشش کرے، اس طرح کھیل جاری رہتا ہے۔ ہوسکتا ہے ایک لڑکا کسی وقت بند نہ سنا پائے تو اسے دوسرا موقعہ ملے گا اور ممکن ہے وہ اگلی بار سنا دے۔"

ایجوکیشن افسر نے آنکھیں جھپکائیں اور اپنی داڑھی کھجائی۔ بچوں کو تھوڑی دیر ہی کھیلنا تھا لیکن انھیں کھیل میں اسقدر لطف آرہا تھا کہ گھنٹی بجنے پر بھی کھیل بند نہیں کر رہے تھے۔ میں نے انھیں تھوڑا وقت اور دیا پھر پردہ گرا دیا۔ میں باہر آگیا اور مجمع سے کہا: "آپ نے دیکھا ہوگا کہ نصابی کتابوں سے نظموں کے کتنے زیادہ بند بچوں کو فرفر یاد ہیں۔ میں انھیں یہ کھیل نظمیں پڑھانے کے گھنٹے میں روزانہ کھلاتا ہوں۔"

جب پردہ پھر اٹھایا گیا تو لڑکے گھیرے میں بیٹھے ہوئے ایک دوسرے سے پہیلیاں بوجھ رہے تھے۔ بڑا جوش و خروش نظر آرہا تھا۔

"اوہو! پہیلیاں اور معمے!" ایجوکیشن افسر بولے "میں نے یہ سب اپنے بچپن میں سنا تھا۔ لیکن کیا یہ نصاب میں شامل ہیں؟"

" نصاب میں تو زبان سکھانا شامل ہے۔ مقصد یہی ہے کہ جاننے کی ان کی خواہش

کی حوصلہ افزائی کی جائے جس سے ان کے علم میں اضافہ ہو۔ لڑکے اس کھیل کو بیحد پسند کرتے ہیں۔ انھیں بے شمار پہیلیاں یاد ہیں! اور زبان کے اعتبار سے ہر پہیلی کی اپنی ایک الگ قیمت ہے۔ اگرچہ نصاب میں انھیں واضح طور پر شامل نہیں کیا گیا ہے، پھر بھی میں نے تو انھیں اپنا لیا ہے اور امید ہے کہ آپ اگلے سال انھیں واضح طور پر نصاب میں شامل کریں گے۔"

پھر ہمارا الفاظ بنانے کا ایک کھیل ہوا۔ ایک لڑکا کوئی لفظ بولتا تو دوسرا اس لفظ کے آخری حرف سے شروع ہونے والا کوئی دوسرا لفظ کہتا۔ یہ کھیل آسان تھا لیکن جب یہ پتہ چلا کہ ہر لڑکے نے ایک مخصوص موضوع چن لیا تھا اور وہ اسی سے متعلق لفظ بولتا تھا، تو کھیل میں دلچسپی بڑھ گئی۔ کچھ لڑکوں نے صرف دریاؤں کے نام بولے، کچھ نے صرف پہاڑوں کے اور بعض نے ہندو اور بعض نے مسلم نام لئے۔

میں نے اپنے ساتھی ٹیچروں کو بتایا کہ میں اپنے لڑکوں کو نئے لفظ معلوم کرنے کے لئے لغت اور نقشے وغیرہ استعمال کرنے کی صلاح دیتا ہوں، اس طرح انھیں بہت سے نئے الفاظ مل جاتے ہیں۔ میں اکثر دیکھتا ہوں کہ وہ اپنا وقت بیکار ضائع کرنے کی بجائے مختلف گروپوں کے الفاظ جمع کرنے میں لگے رہتے ہیں۔ نئے لفظوں کی تلاش میں وہ ایک دوسرے کی مدد بھی کرتے ہیں اور نوٹ تیار کرتے ہیں۔"

"اس کھیل میں کافی صلاحیت ہے"۔ ایجوکیشن افسر نے تصدیق کی۔ "یہ کھیل نہ صرف بچوں کو معلومات اور علم ہی بہم پہونچائے گا بلکہ یہ ذرائع کا سمجھداری سے مطالعہ کرنے کی بھی حوصلہ افزائی کرے گا۔" پھر انھوں نے میری طرف غور سے دیکھا اور کہا: " لگتا ہے آپ نئی نئی چیزیں ایجاد کر رہے ہیں! "

ایک ٹیچر نے آہستہ سے کہا جو ایجوکیشن افسر نہیں سن سکے: "ارے یہ تو خاص طور پر اسی قسم کا کام کرنے آئے ہیں۔ انھیں پڑھانا لکھانا تو ہے نہیں اور سب طرح کی تفریح کراسکتے ہیں! ایک ہم ہیں جو پڑھانے کی کوشش میں کمر توڑ رہے ہیں اور ایک یہ صاحب ہیں کہ سوائے تفریح کے کچھ نہیں کرتے۔"

دوسرے ٹیچر بولے: "اجی اب زمانہ بدل گیا ہے۔ آج نئے ماہرین تعلیم کی باری ہے۔ وہ دن گئے جب دولت کا مطلب تھا ہاتھ میں نقد رقم کا ہونا اور تعلیم حاصل کرنے کا



میں نے دوست ٹیچروں کو بتایا کہ میں اپنی کلاس کے لڑکوں سے کہتا ہوں کہ نئے الفاظ سیکھنے کے لئے وہ ڈکشنری اور نقشوں کی مدد لیں۔

مطلب یہ تھا کہ آپ کیا فرفر سنا سکتے ہیں۔ اب سیکھنے کے لیے کھیلنا پڑتا ہے۔ خدا ہی جانے مستقبل میں یہ لوگ کیا کریں گے! پڑھنے لکھنے سے کسی کو دلچسپی ہی نہیں معلوم ہوتی۔ جو لڑکوں کو کھیلنے کے لئے لے جاتا ہے اسی کو لوگ پسند کرتے ہیں"۔

میں طالب علموں سے بات چیت کرنے میں مصروف تھا لہذا یہ سب باتیں میں نے نہیں سنیں۔ مجھے ان کا پتہ بعد میں چلا۔

جوں ہی میں نے گھنٹی بجائی، سب لڑکے ہاتھوں میں جھاڑو لے کر لائن سے کھڑے ہو گئے۔ میں نے جھاڑو کے ساتھ ڈرل کی اگوائی کی۔ پھر میں نے ان سے سارے اسکول کی صفائی کروائی۔ لڑکے عمارت کے چاروں طرف گئے اور انھوں نے کونا کونا جھاڑو سے صاف کر دیا۔ انھوں نے کوڑا کرکٹ اکٹھا کیا اور ٹوکری میں رکھ کر ہم لوگوں کے پاس لائے۔

ایجوکیشن افسر صاحب اور ٹیچر دیکھ رہے تھے۔ یہ بھی ساری کلاس کے امتحان کا

ایک حصہ تھا۔ایجوکیشن افسر نے کہا: "جھاڑو دے کر ڈرل کرانا مجھے تو کچھ مناسب نہیں لگا۔"

"گندگی ہمارے ملک کا سب سے بڑا مسئلہ ہے۔" میں نے کہا۔ "جب تک دھول اور غلاظت پھیلی رہے گی مجھے تو کوئی راستہ نظر نہیں آتا کہ یہ ملک ترقی کر سکے گا۔یہی وجہ ہے کہ میرا پہلا کام غلاظت پر حملہ کرنا تھا۔ہمیں گندگی کا خاتمہ کرنے کے لئے لڑنا پڑے گا۔ جھاڑوؤں کے ساتھ ڈرل صرف علامتی ہے۔لڑکوں کے لیے میرا پہلا سبق جھاڑو ڈرل ہی ہے۔ جب تک ہمارا کمرہ بالکل صاف ستھرا نہ ہو ہم کوئی کام نہیں کرتے۔اب لڑکوں نے گندگی کو ناپسند کرنا سیکھ لیا ہے۔"

جب ہم لوگ باتیں کر رہے تھے تو لڑکے جا کر اپنے ہاتھ پیر دھو آئے تھے اور دوسرے حکم کے منتظر تھے۔میں نے پھر سیٹی بجائی۔

"آپ کا تجربہ تو عجیب ہی قسم کا معلوم ہوتا ہے۔" ایجوکیشن افسر نے کہا "چوتھی کلاس کو پڑھاتے ہوئے آخر اس طرح کا اور کتنا کام آپ نے کر لیا ہے؟"

"میرے تجربے میں اس طرح کی سرگرمیوں کی گنجائش ہے۔ چوتھے درجے میں سکھانے سے پہلے یہ سب تو میں درجہ اول میں ہی سکھا دیتا۔"

ہم لوگ بات ہی کر رہے تھے کہ سارے لڑکے کمپاؤنڈ میں جا پہونچے۔وہ پیڑوں پر چڑھ گئے تھے۔میری دوسری سیٹی پر وہ سب نیچے کود پڑے۔اور جب میں نے تیسری سیٹی دی تو پھر پیڑ پر چڑھ گئے۔میں نے چوتھی سیٹی بجائی تو سب کے سب نیچے اتر آئے۔

"ارے واہ! یہ تو عجیب قسم کی تعلیم ہے!" ہیڈ ماسٹر صاحب نے کہا: "یہ تو پڑھائے بغیر ہی سیکھا جا سکتا ہے۔آخر یہ کس قسم کی تعلیم ہے؟"

میں نے ہیڈ ماسٹر کو بتایا کہ آجکل یہ چیزیں سکھائے بغیر کوئی نہیں سیکھتا۔ہم ایسی چیزیں سکھانے یا سیکھنے کی اجازت ہی نہیں دیتے۔ہم تو لڑکوں کو یہ سب سکھانا چاہتے ہی نہیں۔

"جی نہیں۔یہ بات صحیح نہیں ہے۔"

"اچھا دیکھتے ہیں۔" میں نے کہا: "اپنے اسکول کے بچوں سے پوچھئے کہ ان میں سے کتنے پیڑ پر چڑھ سکتے ہیں۔"

ایجوکیشن افسر نے دوسرے درجوں کے لڑکوں سے جو وہاں بیٹھے تھے کہا کہ وہ

پیڑ پر چڑھیں لیکن مشکل سے دو تین ہی ایسے تھے جو چڑھ پائے۔

"جناب!" میں نے کہا "میں نے اپنے لڑکوں کو بہت ساری چیزیں سکھا دی ہیں۔ یہ سب میرے تعلیمی تجربے کا ایک حصہ ہیں۔" پھر میں نے ذرا مذاق کے انداز میں کہا: "جناب امتحان دینے والوں کی فہرست میں ان سب کا نام ہے۔ آپ کو انھیں نمبر دینے چاہئیں۔"

ایجوکیشن افسر نے بھی مزا لیتے ہوئے پوچھا: "اور آپ کو! کیا آپ کو بھی نمبر چاہئیں؟"

ایک بار اور سیٹی بجانے پر لڑکوں نے الماری سے اپنے لٹو اور ڈوریاں نکالیں اور لٹو نچانے لگے۔یہ کھیل بے مقصد نہیں تھا، جیسا کہ لڑکے عموماً سڑکوں پر کھیلتے ہیں۔یہاں لڑکے شور وغل مچائے بغیر قاعدے سے لٹو نچا رہے تھے۔کسی نے دھوکہ نہیں دیا، ہر ایک کے لیے جگہ مقرر تھی، اور سب لڑکوں نے اپنے لیڈر کا کہا مانا۔

وہاں پر موجود سبھی لوگوں نے اپنے بچپن میں لٹو نچایا تھا چنانچہ کھیل دیکھنے میں انھیں بڑا مزا آیا۔

ایجوکیشن افسر نے پوچھا: "انھیں لٹو نچانا کس نے سکھایا ہے؟ یہ لڑکے تو قاعدے کے مطابق اور بڑی تمیز سے کھیل رہے ہیں۔" میں نے کہا: "جناب دریا کا کنارہ ہمارے مشق کرنے کی جگہ ہے۔ہم وہاں گھومنے جاتے ہیں اور اپنی ایسی بہت سی سرگرمیاں وہاں ہی انجام دیتے ہیں۔لڑکے بس کھیل کھیل ہی میں بہت کچھ سیکھ جاتے ہیں۔"

ایجوکیشن افسر بولے: "آپ ٹھیک کہتے ہیں۔حال ہی میں میں نے پڑھا ہے کہ بچے کھیل کے ذریعے سیکھتے ہیں۔" پھر انھوں نے ہیڈ ماسٹر صاحب کی طرف دیکھ کر کہا: "کہئے آپ یہ سب چیزیں کب ہمارے اسکول میں شروع کرائیں گے؟"

"اگر ہم ایسی چیزیں شروع کر دیں تو پھر کورس کب پورا کریں گے؟" ہیڈ ماسٹر صاحب نے پوچھا۔ "یہ صاحب باقاعدہ ٹیچر تو ہیں نہیں۔جو کچھ یہ کر سکتے ہیں کرتے ہیں، اور یہ کہہ کر بچ نکلتے ہیں کہ، یہ تو تجربہ تھا،میں جو کر سکا کر دیا۔باقی میں نہیں کر سکا۔لڑکے اسے نہیں کر سکے۔اور آپ بھی اس سے اتفاق کر لیں گے، اور کہیں گے کہ تجربے کے نتائج

منظور کئے جائیں ۔ چاہے وہ جو بھی ہوں ۔ دوسری طرف ہم لوگ نصاب کے پابند ہیں ۔ آپ
خود ہمیں یاد داشتیں بھیجتے رہتے ہیں جن میں پوچھا جاتا ہے کہ "نصاب کیوں نہیں پورا ہوا؟
نتیجے کیوں خراب ہیں؟ اور کام وقت پر کیوں نہیں پورا کیا گیا؟"

ایجوکیشن افسر ہلکے سے مسکرائے ۔ انھوں نے کچھ کہا نہیں ۔ میں دیکھ رہا تھا کہ وہ
کچھ چڑھ سے گئے تھے ۔ لیکن انھوں نے کوئی تبصرہ کرنے سے اپنے آپ کو روک لیا ۔

میں نے سیٹی بجائی ۔ لڑکے اپنی قمیضیں اتار کر قطار میں کھڑے ہو گئے ۔ وہ
بالکل سیدھے کھڑے تھے ۔ وہ بہت تندرست اور صاف ستھرے تھے ۔ ان کے ہاتھ پیر اور
بال سب بیحد صاف تھے ۔ برہمن لڑکوں کے جنیو صاف ستھرے تھے ۔ کسی کا ناخن گندہ
نہیں تھا اور ان کے بال بھی اچھی طرح کٹے ہوئے تھے ۔ آنکھیں چمک رہی تھی اور ٹوپیاں
صاف تھیں ۔

ایجوکیشن افسر نے مسکرا کر کہا: "اس کے لئے آپ کتنے دنوں سے تیاری
کر رہے تھے؟ جسمانی صفائی سکھانے کے لئے آپ کو کافی کوشش کرنی پڑی ہوگی؟"

"جی ۔ پچھلے چھ مہینے سے تیاریاں ہو رہی ہیں ۔ میں اس کے لیے چھ مہینے سے
کوشش میں ہوں اور آپ کو معلوم بھی ہے ۔"

میں نے ایک بار پھر سیٹی دی ۔ لڑکوں نے قمیضیں پہنیں، قطار میں کھڑے
ہوئے، سلام کیا، اور چلے گئے ۔

ہیڈ ماسٹر صاحب نے ذرا طنزیہ انداز میں کہا: "اچھا تو امتحان ختم ہوا؟"

"جی ابھی نہیں ۔" میں نے کہا: "مہربانی کر کے آپ لوگ پاس کے کمرے میں
تشریف لے آئیں" ۔

"ہاں ۔ ہاں یقیناً ۔ آپ نے یہ کمرہ تو کئی دن سے لے رکھا ہے اور ہم میں سے
کسی کو وہاں جانے نہیں دیا ہے ۔" ہیڈ ماسٹر صاحب بولے ۔ "آپ وہاں کچھ اکٹھا کر رہے
تھے ۔ ہے نا ۔"

میں نے کہا: "آپ خود ہی آ کر دیکھ لیجئے ۔"

ہم سب لوگ کمرے میں داخل ہوئے ۔

"اچھا یہ تو ایک چھوٹا سا عجائب گھر معلوم ہو رہا ہے" ۔ ایجوکیشن افسر بولے ۔

"میں سمجھ گیا تھا ۔" ۔ ہیڈ ماسٹر صاحب نے کہا ۔ "لڑکے ادھر ادھر سے بھاگ بھاگ
کر چیزیں لا رہے تھے اور یہاں رکھ رہے تھے ۔"

میں نے بتایا کہ سبھی لڑکے اس کام میں بڑا جوش و خروش دکھا رہے تھے ۔ میں
نے ان سے کہا تھا کہ وہ نمائش میں اپنی چیزیں جس طرح چاہیں رکھیں ۔ میں اس بارے میں
کوئی رہنمائی نہیں کرونگا ۔

"کیا بچوں نے یہ ساری چیزیں اپنے آپ ہی سجا کر رکھی ہیں؟" ایجوکیشن افسر نے پوچھ

"ہاں جناب ۔"

"مجھے تو یقین نہیں آ رہا ہے! ایسا ممکن نہیں ہو سکتا ۔" انھوں نے کہا: "سب کچھ
کس خوبصورتی سے ترتیب دیا گیا ہے اور کتنے اچھے ذوق کا مظاہرہ کر رہا ہے ۔"

میں نے کوئی جواب نہیں دیا ۔ میرا کام خود زبان حال سے بول رہا تھا ۔ "یہ ساری
چیزیں آپ نے کہاں سے اکٹھا کی ہیں؟ یہ سب تو نیچر اسٹڈی (فطرت کا مطالعہ) کے لئے بڑا
ضروری سامان ہے ۔" ایجوکیشن افسر نے کہا

میں نے جواب دیا" خود نیچر سے ہی لی ہیں ۔ ہم نے یہ ساری چیزیں، فطرت کا
مطالعہ کرنے کی غرض سے سیر کرتے ہوئے جمع کی ہیں ۔"

ہیڈ ماسٹر صاحب بولے: "شاید ان جگہوں سے جہاں لڑکے گھومنے جایا کرتے تھے ۔

"بڑا شاندار کام ہے ۔" ایجوکیشن افسر نے کہا ۔ "اب اس عجائب گھر کو ختم مت
کر دیجئے گا ۔ یہ سارے اسکول کے لیے بڑا مفید ہو گا ۔ ہم دوسرے ٹیچروں سے کہیں گے کہ وہ
اس کے سامان میں اضافہ کریں ۔"

"ٹیچر لڑکوں کو پڑھائیں گے کب؟" ہیڈ ماسٹر صاحب آہستہ سے بولے ۔ بچوں نے
جمع کی ہوئی چیزوں کی ایک فہرست تیار کی تھی ۔ ایجوکیشن افسر اسے پڑھ کر بڑے خوش
ہوئے انھوں نے کہا: "ان بچوں کو ضرور انعام ملنا چاہیئے ۔"

"جناب ۔ عجائب گھر کے واسطے چیزیں اکٹھا کرنا ہی خوشی کی بات تھی ۔ وہی ان
کا انعام ہو گیا ۔ یہ عجائب گھر ہی ان کا انعام ہے ۔" "پھر بھی ۔ ۔ ۔" ایجوکیشن افسر نے جملہ
ادھورا چھوڑ دیا ۔ میں خاموش رہا کمرے کے ایک کونے میں کھلونے رکھے تھے ۔

"یہ کھلونے کس نے بنائے ہیں؟" ایجوکیشن افسر نے پوچھا ۔

"بچوں نے اور کس نے! جو بھی چیزیں آپ یہاں دیکھ رہے ہیں اس میں میرا
کوئی ہاتھ نہیں ہے ۔"

"لیکن انھوں نے ٹیرا کوٹا کے یہ سارے کھلونے کہاں بنائے اور انھیں کیسے پکایا؟"

"یہ کھلونے دریا کے کنارے بنائے گئے اور ہفتے کی چھٹی کے دن ان کو پکایا گیا

"بھئی آپ کا دماغ تو خوب کام کرتا ہے !آپ کا تجربہ کمال کا ہے۔ آپ کے پاس کوئی سامان نہیں تو آپ دریا کے کنارے چلے جاتے ہیں۔ کھیتوں کی مٹی سے طرح طرح کی چیزیں بنواتے ہیں۔۔۔شاباش ! "انھوں نے کہا۔ وہ بے حد خوش تھے۔

میں نے انھیں آگے کچھ اور نہیں کہنے دیا اور بیچ میں ہی بول پڑا۔ "کیا آپ لوگ تھوڑی دیر کے لئے برآمدے میں جائیں گے؟ میں آپ کو کچھ اور بھی دکھانا چاہتا ہوں۔"

جب سب لوگ بیٹھ گئے تو ہیڈ ماسٹر صاحب کچھ سوچ میں تھے کہنے لگے: "جناب ہم لوگ یہ سب کریں تو، لیکن پھر پڑھائیں گے کب؟"

میں کچھ گتے لے آیا۔ ایک پر لڑکوں کی لکھائی کے نمونے تھے۔ جو اس وقت کے تھے جب میں نے کلاس کا چارج لیا تھا، اور دوسرے گتے پر صرف ایک دن پہلے کی ان کی لکھائی کے کچھ نمونے تھے۔ کارڈ پر سرخی لکھی تھی۔

"لکھائی میں بہتری کی رپورٹ"

سوائے ایک ٹیچر کے سبھی نے لڑکوں کی لکھائی میں بہتری کو سراہا۔ وہ ٹیچر چپکے سے بولے۔ "یہ تو ضرور کسی ایسے لڑکے نے خاص طور پر بنا بنا کر لکھا ہے جس کی لکھائی اچھی ہے اور اسے ہی دکھایا جا رہا ہے"۔

مجھے ان کا یہ الزام ناگوار تو بہت گذرا لیکن میں نے در گذر کیا۔ اسقدر گھٹیا اور کمینی بات پر دھیان دینے کی ضرورت ہی نہ تھی۔ ایجوکیشن افسر نے پوچھا: "آپ یہ تبدیلی کیسے لائے؟"

"بہت سے طریقوں سے۔"

"فرض کیجئے ہم یہ طریقے اپنے اور اسکولوں میں شروع کریں تو کیسا رہے گا؟"

"جی ہاں یہ ہوسکتا ہے۔" میں نے کہا۔ "میں وہاں بھی ایسا ہی کر کے دکھاؤں گا۔"

پھر میں ایک کاپی لایا۔ اس میں درج تھا کہ پچھلے چھ مہینے میں میری کلاس کے ہر طالب علم نے کتنی کتابیں پڑھی ہیں۔ کاپی کے ہر صفحے پر ایک طالب علم کا نام لکھا ہوا تھا اور اس کے نیچے اس لڑکے نے خود اپنے ہاتھوں سے اپنی پڑھی ہوئی کتابوں کے نام لکھ دئیے تھے۔ کاپی کے آخر میں میں نے کچھ اعداد و شمار لکھے تھے جیسے لڑکوں کی پڑھی ہوئی کتابوں کی اوسط تعداد، ان لڑکوں کے نام جنھوں نے سب سے زیادہ، اور ان کے بھی

جنھوں نے سب سے کم کتابیں پڑھیں وغیرہ۔ میں نے یہ بھی لکھ رکھا تھا کہ کون سی کتابیں سب سے زیادہ مقبول تھیں۔ لڑکوں کی پڑھی ہوئی کتابوں کو ان کے مضمون کے اعتبار سے بانٹ دیا گیا تھا اور دکھایا گیا تھا کہ لڑکے کن مضامین کو زیادہ پسند کرتے ہیں۔

ایجوکیشن افسر نے یہ سب کچھ دیکھا اور حیران رہ گئے۔ "لڑکوں نے اتنی ساری کتابیں پڑھ ڈالی ہیں ! اور اتنے بہت سے مضامین کی ! انھوں نے یہ سب پڑھا کب؟"

"ہاں جناب یہ ایک حقیقت ہے کہ انھوں نے یہ ساری کتابیں پڑھ لی ہیں اور انھوں نے یہ کتابیں میری نگرانی میں پڑھی ہیں۔" میں نے جواب دیا۔

ایجوکیشن افسر نے ہیڈ ماسٹر سے پوچھا: "ذرا بتائیے آپ کے اسکول کے ساتویں درجے کے بچوں نے پچھلے چھ مہینے میں کتنی کتابیں پڑھی ہوں گی؟"

"وہ اس قسم کی اتنی کتابیں کیسے پڑھ سکتے ہیں؟ اگر وہ ایسی کتابیں پڑھیں تو انھیں تاریخ، جغرافیہ اور جیومیٹری وغیرہ کی باقاعدہ پڑھائی کا وقت کہاں ملے گا؟"

ایجوکیشن افسر کچھ نہیں بولے۔ وہ کچھ سوچ رہے تھے۔ پھر انھوں نے مجھ سے کہا: "آپ کے لڑکے زبان کے امتحان میں بغیر کسی باقاعدہ امتحان کے پاس ہو گئے ہیں۔ اچھا تو اب اور کیا باقی رہ گیا ہے؟"

میں طالب علموں کے ہاتھ کا لکھا ہوا ایک رسالہ لے آیا۔

ایجوکیشن افسر نے پوچھا: "کیا یہ سارے کے سارے مضامین لڑکوں نے ہی لکھے ہیں؟"

"ہاں جناب"

"اس میں دو تین نظمیں بھی ہیں۔ کیا یہ بھی لڑکوں نے لکھی ہیں؟"

"جی ہاں۔ کچھ دنوں سے دو لڑکے نظمیں لکھنے کی بھی کوشش کر رہے ہیں۔"

"اچھا جو کچھ لڑکے لکھتے ہیں آپ کیا اس کو درست کرتے ہیں یا اس کو کچھ تبدیل کر دیتے ہیں؟"

"جی نہیں۔ ابھی تک تو ایسا نہیں کیا۔ وہ ویسے ہی پیش کی گئی ہیں جیسے کہ لڑکوں نے لکھی تھیں۔"

"کیا یہ لڑکوں کی لکھی چیزیں ہیں یا کہیں سے لی گئی ہیں؟ کیا آپ انھیں لکھنے کے لیے خیالات دیتے ہیں۔"

"دوسروں کی تحریروں کی نقل سے کیا فائدہ؟ میں ان سے کہتا ہوں کہ وہ صرف وہی لکھیں جو ان پر گذرتی ہے اور اپنی تحریروں کو رسالے میں پیش کریں۔ وہ اپنی لکھی

چیزیں پسند کرتے ہیں اور میں ان سب کو پیش کر دیتا ہوں ۔"

"کیا یہ چھ ماہی امتحان کے واسطے تیار کی گئی کوئی خاص چیز ہے ؟"

"نہیں جناب ! ہم پچھلے تین مہینے سے ، ہر مہینے ایسا رسالہ نکال رہے ہیں ۔ اب چھ ماہی میں اسے پیش تو کر دیا گیا ہے لیکن یہ اس کے لیے خاص طور پر تیار نہیں کیا گیا تھا ۔"

ایجوکیشن افسر نے پسندیدگی ظاہر کرتے ہوئے اپنا سر ہلایا ۔ "کافی دشوار کام ہے ۔" وہ بولے ۔ " آپ تو بہترین کام کر رہے ہیں ۔ چھ مہینوں میں کس قدر کامیابی حاصل کر لی ہے !"

ہیڈ ماسٹر صاحب نے مداخلت کی : "اچھا حساب ، جغرافیہ اور تاریخ کے امتحان کب ہوں گے ؟ کیا ہم لوگوں کو تیسرے پہر بھی یہاں موجود رہنا ہو گا ؟"

غالباً وہ مجھے طعنہ دینا چاہتے تھے ۔ انھیں ضرور معلوم رہا ہو گا کہ میں نے حساب اور جغرافیے میں بہت کم کام کیا تھا ۔

میں نے کہا ۔ " دیکھئے میں جغرافیے اور حساب میں ابھی کچھ نہیں کر پایا ہوں لیکن میں یہ سارے مضامین سالانہ امتحان سے پہلے پورے کرا دوں گا ۔ تاریخ میں بھی جو کچھ ہوا ہے وہ اتنا نہیں جتنا ہونا چاہئے تھا ۔"

ہیڈ ماسٹر صاحب نے کہا : "اچھا جو خاص چیزیں تھیں وہ تو رہ ہی گئیں ۔"

"یہ تو آپ کا نقطہ نظر ہے ان کا نہیں ۔" ایجوکیشن افسر بولے ۔ " آپ کے خیال میں تاریخ ، جغرافیہ اور حساب پڑھانا تعلیم کا سب سے دشوار حصہ ہے ۔"

ایجوکیشن افسر صاحب کا موڈ خوشگوار تھا ، لہذا ہیڈ ماسٹر صاحب نے بھی دوبدو جواب دیا : "جناب آپ کے نقطہ نظر سے بھی تو ایسا ہی ہے ۔ آپ بھی ان مضامین میں نتیجے کے خواہش مند رہتے ہیں ۔"

اس ہلکی پھلکی گفتگو سے ماحول بہتر ہو گیا ۔

سب لوگ جانے کی تیاری کرنے لگے ۔ ایجوکیشن افسر نے مجھ سے پوچھا : " آپ کی نتیجوں کی فہرست کہاں ہے ؟"

"جی ۔ میں نے فہرست تیار ہی نہیں کی ۔" میں نے جواب دیا ۔

"اچھا تو جائیے آپ کی کلاس کو امتحان سے چھوٹ دیدی گئی ۔"

چوتھا حصہ

آخری جلسہ

1

چھ ماہی امتحان کے کچھ دنوں بعد میں اسکول میں ایک روز اپنے ساتھیوں سے ادھر ادھر کی باتیں کر رہا تھا۔

چندر شیکھر بولے : "بھئی تم تو کمال کے آدمی نکلے ! مجھے ماننا ہی پڑے گا کہ تمھارا تجربہ کامیاب رہا ہے۔ ہم لوگوں کو یقین ہی نہیں تھا کہ کسی پرائمری اسکول میں اس طرح کی بات ممکن ہے۔"

بھدر شنکر نے ان کے جواب میں کہا: "بھئی یہ تو انگریزی جانتے ہیں نا، اسی لئے انگریزی کتابیں پڑھتے ہیں اور ان کتابوں سے ان کو تجربہ کرنے کے لیے نئے نئے خیالات مل جاتے ہیں۔"

چمپک لال نے کہا : "ہاں شائد ایسا ہی ہو، لیکن یہ جناب ایسا کر سکتے ہیں۔ انھیں نہ تو روپئے پیسے کی فکر ہے، نہ ہی یہ پرواہ کہ امتحان کا نتیجہ کیا رہے گا۔ اگر تجربہ ناکام بھی رہا تو ان کا کوئی نقصان نہیں ہو گا۔"

وینی لال بولے : "بھیا ہم ایسے تجربے کیسے کر سکتے ہیں؟ تجربے میں تو خاصا وقت لگتا ہے اور کس کے پاس اتنا سب سوچنے اور تیاری کرنے کا وقت ہے۔ اپنے پرائیویٹ ٹیوشنوں کی ہمیں فکر رہتی ہے، ہر شام ایجوکیشن افسر کے یہاں ہمیں رپورٹ کرنے جانا پڑتا ہے۔ بال بچوں کی دیکھ بھال ہم کریں، پھر ملنے ملانے، اور گھر برادری کے کاموں میں بھی شرکت کرنی پڑتی ہے۔ آخر ہم کیا کیا کریں؟ یہ تو ایک آزاد پنچھی کی طرح ہیں۔ یہ سب باتیں کر سکتے ہیں۔"

آخر میں بول پڑا : "دیکھو بھائیو ! ہم لوگ پرائمری اسکولوں میں جو کچھ کام کرتے ہیں، اس سے اور بھی بہت زیادہ کر سکتے ہیں۔ ابتدائی تعلیم کے پورے نظام کی کایا

ہی پلٹ سکتی ہے ۔ بس ضرورت اس بات کی ہے کوئی آدمی اسے بدلنے کا تہیّہ کرے ۔ آج طبیعی اور سماجی لحاظ سے دنیا جیسی ہے ویسی پہلے تو نہیں تھی ۔ لوگوں نے اسے بدل ڈالا ہے ۔ ہم میں جوش اور ولولہ ، خوداعتمادی اور مقصد حاصل کرنے کے لئے انتھک لگن کا جذبہ ہونا چاہئے ۔ تجربے صرف اس لیے کامیاب نہیں ہوتے کہ کسی کو انگریزی زبان آتی ہے ۔ یہ تو ایک بے کار سا بہانہ ہے ۔ جب کوئی کام نہیں کرنا چاہتا تو اسی بہانے کی آڑ لیتا ہے ۔ اصل بات خود اپنے سے نئے نئے طریقے ایجاد کرنا ہے ۔ اور یہ چیز کسی مقصد کے لیے اپنی روح کی گہرائیوں سے چاہنے سے پیدا ہوتی ہے ۔ چمپک لال جی ، نتیجے کی فکر اس شخص سے زیادہ کسی کو نہیں ہوتی جو تجربہ کر رہا ہو ۔ آپ کو مالی فائدے کے لئے نتیجے کی فکر ہوتی ہے ، لیکن میری ناکامی کا مطلب تو یہ ہوگا کہ تجربہ کرنے کے دروازے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بند ہوجائیں گے ۔ نہ صرف یہ بلکہ میری ناکامی ، آئندہ کے لئے دوسروں کا دروازہ بھی بند کردے گی ۔ میں وینی بھائی کو بتانا چاہوں گا کہ بیٹھ کر بے کار باتیں کرنے اور دوسروں سے تعلقات قائم کرنے کا تو ہمارے پاس خاصا وقت نکل آتا ہے ۔ اور یہ بتائیے کہ ایجوکیشن افسر کے گھر روز روز جانے کو آپ سے کس نے کہا ہے ؟ اگر ہم اپنا کام اچھی طرح انجام دیتے ہیں تو ہمیں ان کی خوشامد کرنے کی کیا ضرورت ہے ؟ جو کام نہیں کرتے انھیں خوشامد کی ضرورت پڑتی ہے ۔ اگر ہم لوگ لڑکوں کو کلاس میں اچھی طرح پڑھائیں تو انھیں گھر پر ٹیوشن لینے کی ضرورت ہی کیوں پڑے ! جب ہم لوگ اسکول میں ٹھیک سے نہیں پڑھاتے تب ہی گھر پر پرائیویٹ ٹیوشن لینے کی ضروروت پڑتی ہے ۔"

شیوشنکر نے بیچ میں ٹوکا : "لیکن میرے پیارے بھائی ! آپ ہماری کم تنخواہوں کو کیوں بھول جاتے ہیں ؟ آپ کو تو بھاری رقم ملتی ہے مگر ہم کو تو نہیں ملتی ۔ آخر ہم کیا کریں ؟"

"آپ بھی تنخواہ زیادہ مانگیے ـــ آپ کو ملے گی ۔"

"جی ہاں ضرور ملے گی !" وشوناتھ نے کہا " تنخواہ میں اضافہ کے بجائے نوکری سے چھٹی ضرور کردی جائے گی !"

"چلئے تمام ٹیچر لکھ کر مطالبہ کریں ۔ دیکھتے ہیں کہ کتنوں کو نوکری سے رخصت کرتے ہیں ۔ میں تو کہوں گا کہ اس سے پہلے کہ وہ لوگ ہمیں نکالیں ، ہم خود کیوں نہ

نوکریوں کو ٹھکرا کر چلے جائیں ؟ تھوڑی ہمت کیجئے ۔ نڈر بنئے ۔ میں تو نڈر ہوں اسی لیے جیسا چاہتا ہوں کرلیتا ہوں ۔"

بھدر شنکر نے کہا : پھر ہماری گذر بسر کیسے ہوگی ؟"

"گذر بسر ! ارے بھائی خدا انھیں کی مدد کرتا ہے جو اپنی مدد آپ کرتے ہیں ۔ نوکریوں کی کوئی کمی نہیں ۔ میں گذارے کے لیے جھاڑو دینے کا بھی کام کرلوں گا ۔ میں تم لوگوں کی طرح آدھے پیٹ کھا کر نہیں رہوں گا ۔ تم لوگوں کی موجودہ تنخواہ بھی کوئی تنخواہ ہے ؟"

"اجی صاحب ۔ آپ کو یہ نہیں پتہ کہ ہماری نوکریوں پر آنے کے لیے کتنے آدمی تیار ہوجائیں گے ۔" وشوناتھ بولے ۔

" تو ہمیں پکٹنگ کرنی چاہئے ۔ ہم نئے آدمیوں کو چارج نہیں دیں گے ۔ ہم انھیں اپنی ملازمتیں نہیں لینے دیں گے ۔ ہمیں اسکول میں دن رات پکٹنگ کرنا ہوگی ۔ ہمیں دوسروں کو اس گڈھے میں نہیں گرنے دینا چاہئے جس میں خود گر گئے ہیں ۔ ہم ان سے درخواست کریں گے کہ فاقے ، خوشامد اور کاہلی کی دلدل میں دھنسنے کی بجائے وہ کوئی دوسرا پیشہ یا کاروبار اختیار کریں ۔"

ہم لوگ باتیں کرتے رہے ۔ کرتے رہے ۔ میں نے دیکھا کہ ٹیچر بڑے جوش و خروش سے اپنا ردعمل ظاہر کر رہے ہیں ۔ مجھے ایسا محسوس ہوا کہ غلامی کے پرانے نظام کی بنیاد میں جیسے ایک چنگاری لگ گئی ہے ۔

II

میں نے جغرافیہ پڑھانے کا ارادہ کیا ۔ میں نے جغرافیے کی کتابیں پڑھیں اور مایوسی سے ایک طرف اٹھا کر رکھ دیں ۔ جب میں نے نصاب دیکھا تو کچھ جھلاہٹ سی ہوئی ۔ آخر سب بچے دریاؤں اور پہاڑوں کے نام کیوں یاد کریں ؟ میں نے سوچا خود مجھے ہی یہ سب

یاد نہیں ۔ کل ایجو کیشن افسر صاحب بھی نقشے کی مدد سے آسٹریلیا کا راستہ تلاش کر رہے تھے ۔ بچپن میں رٹا ہوا جغرافیہ کیسے یاد رہ جاتا ہے ؟ اس طرح کا جغرافیہ بچوں کو پڑھایا ہی کیوں جائے ؟ خود مجھے جغرافیہ صحیح معنوں میں اس وقت سمجھ میں آیا تھا جب میں افریقہ گیا۔ اسی وقت مجھے جغرافیہ کا گہرائی سے علم ہوا۔ اور آج مجھے اس سے بہت ہی زیادہ دلچسپی ہے ۔ مجھے یہ مضمون بڑا ہی مفید معلوم ہوتا ہے ۔ لیکن اس عمر میں آخر بچوں کو یہ سب پڑھانے اور سمجھانے کی ضرورت کیا ہے ؟ میں نہیں سمجھتا کہ اس نصاب پر چلنا عقلمندی ہوگا۔ نصاب کی کتاب دیکھ کر تو مجھے ہنسی آ گئی۔ کیا میں ایجو کیشن افسر سے ملوں ؟ سوچتا ہوں بہتر ہو گا کہ میں ان سے اپنے طریقے سے جغرافیہ پڑھانے کی اجازت لے لوں تا کہ بچوں میں جغرافیہ سے لگاؤ پیدا ہو اور وہ اس کی طرف راغب ہوں ۔

میں ایجو کیشن افسر کے پاس گیا۔

انھوں نے پوچھا " کہئے ؟"

میں نے کہا : "جناب فرض کیجئے کورس سے جغرافیہ کا مضمون ہم بالکل ہٹا ہی دیں ۔ کیا ایسا کیا جاسکتا ہے ؟"

"ارے نہیں۔" وہ بولے ۔ "یہ تو ہم نہیں کر سکتے ۔ جغرافیہ ایک بڑا ہی اہم مضمون ہے ۔ آج کل اس کی اہمیت تاریخ سے بھی زیادہ ہے ۔ ہمارے تجربے میں کسی مضمون کو چھوڑ دینے کی گنجائش نہیں ہے ۔ بس مضمون کو بہتر طریقے سے پڑھا دینا ہی ہمارا مقصد ہے اور پڑھانے کے لیے آپ جو طریقہ چاہیں اختیار کریں لیکن آپ کو دوسرے ٹیچروں کو یہ دکھا دینا ہو گا کہ جغرافیہ بھی ایک دلچسپ مضمون ہے اور اسے بھی اچھے طریقے سے پڑھایا جاسکتا ہے ۔ آپ کے تجربے کا امتحان اسی بات میں ہے ۔"

ایجو کیشن افسر نے بڑی ہوشیاری سے مجھے خاموش کر دیا۔ پھر بھی میں نے اصرار کیا : "لیکن یہ نصاب اور کا..س کی کتاب تو میں پڑھانا نہیں چاہتا ۔ میں تو جغرافیہ اپنے طریقے سے پڑھاؤں گا ۔ مجھے یقین ہے کہ آپ کو مایوسی نہیں ہو گی ۔"

ایجو کیشن افسر نے یہ کہا ۔ "میں بھی یہی چاہتا ہوں " ۔ چند لمحے بعد انھوں نے ایک اور نکتہ نکالا۔

"ہم لوگ جو امتحان لیتے ہیں اس کے بارے میں آپ کیا سوچتے ہیں ؟ نئی تعلیم

کے حامی تو امتحان کے بالکل ہی خلاف ہیں ۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ ایک بری چیز ہے ۔ لیکن ہمیں تو محکمہ چلانا ہے اس لیے امتحانوں سے چھٹکارہ نہیں پا سکتے ۔ ہمیں تو کام کا نتیجہ معلوم ہی کرنا ہے ۔ اگر ہم امتحان ختم کر دیں تو پھر ٹیچر شائد پڑھائیں ہی نہیں ۔ اور مان لیجئے کوئی ایماندار ٹیچر پڑھا بھی دے تو پھر ایسا کوئی ذریعہ نہیں کہ یہ پتہ چلے کہ اس نے ٹھیک سے پڑھایا کہ نہیں ۔ ہمارے پاس ایسا کوئی ذریعہ ہونا چاہئے جس سے معلوم کیا جاسکے کہ طالب علموں نے فائدہ اٹھایا کہ نہیں ۔ کیا خیال ہے آپ کا؟"

"جی آپ کا مسئلہ تو حقیقی ہے جب تک ہر لڑ کا اسکول جائے گا اور کسی بھی ٹیچر کو پڑھانے کا کام سونپا جائے گا، امتحان ہونا ضروری ہے ۔ وہ اسی وقت ختم کئے جاسکتے ہیں جب لڑکے دل سے سیکھنے کی امنگ لے کر اسکول آئیں اور انھیں ایسے ٹیچر پڑھائیں جنھیں پڑھانے کا فن آتا ہو اور جن میں جوش اور ولولہ ہو لیکن آج کل کے زمانے میں بھاڑے کے کام کا جو چلن ہے اس میں تو امتحان کی ہمیشہ ہی ضرورت رہے گی ۔"

"درست ہے ۔ لیکن اگر اس نظام میں کچھ تبدیلیاں لائی جاسکتی ہوں تو میں ان پر غور کرنے کو تیار ہوں ۔"

میں نے کہا : "ابھی تو آپ سال میں صرف دو مرتبہ امتحان کراتے ہیں یعنی چھ ماہی اور سالانہ ۔ اس کے بجائے آپ ہر مہینے امتحان کروائیے ۔ اگر طالب علم کو امتحان دینا ہی ہے تو پھر بہتر ہے کہ وہ اس سے اور زیادہ واقف ہو جائے ۔ کسی چیز سے واقفیت، ڈر کو کم کر دیتی ہے اور ہم بوجھ اٹھا لیتے ہیں ۔ دوسری بات یہ ہے کہ امتحان کو صرف کامیابیوں کی جانچ ہی نہیں بلکہ اسے لڑکوں کی کمزوریاں معلوم کرنے اور انھیں ان کمزوریوں سے خبر دار کرنے کا ذریعہ سمجھنا چاہئے ــــ یہی بڑا فرق ہے ۔ تیسرے یہ کہ ان طالب علموں کو جنھیں پورا بھروسہ ہے کہ وہ اپنا مضمون اچھی طرح جانتے ہیں، امتحان سے چھوٹ بھی دے سکتے ہیں ۔ لڑکے اپنی کمزوریاں جاننے کے لیے اگر چاہیں تو امتحان میں بیٹھا کریں ۔ جو لڑکے امتحان میں نہیں بیٹھیں گے انھیں اپنی کمزوریاں جاننے کا موقعہ نہیں ملے گا۔ امتحان انھیں مضامین میں لئے جانے چاہئیں جن میں مناسب جانچ کی جاسکتی ہو۔ دوسرے مضامین میں امتحان لینے کی ضرورت ہی نہیں ہے ۔ اس کے علاوہ ہمیں لڑکوں کو امتحان دیتے وقت کتاب دیکھنے کی اجازت بھی دینی چاہئے ۔ جس طریقے سے ایک طالب علم کتاب کا استعمال

کرے گا وہ بذات خود اس کا امتحان ہو گا۔ اور پھر ہمیں چاہئے کہ ہم طالب علموں کو نتیجے کے حساب سے تین قسموں میں بانٹ دیں یعنی اگلے درجے میں چڑھائے جانے کے ناقابل طلباء، وہ طلباء جنھیں اپنے کمزور مضامین میں بہتری لانے پر اگلے درجے میں پروموٹ کیا جاسکتا ہے اور وہ طالب علم جو اگلے درجے میں پروموٹ کئے جانے کے قابل ہیں ___ ہمیں یہ طریقہ ختم کر دینا چاہئے کہ لڑکا اول، دوم آیا یا اور نیچے رہا ___"

"بھئی اگلے سال تو مجھے آپ کو اپنا نائب مقرر کر لینا چاہئے۔" ایجو کیشن افسر نے کہا۔

میں مسکرایا اور اپنی بات جاری رکھی۔ "اور ٹیچروں کو خود ہی امتحان لینا چاہئے۔ وہ کسی بھی دوسرے شخص کی بجائے اپنے طالب علموں کی صلاحیت اور کام میں ان کی کمزوری کی وجہیں زیادہ اچھی طرح جانتے ہیں۔ ٹیچر اس بات کا بہترین فیصلہ کر سکتے ہیں کہ لڑکا درجہ چڑھانے کے لائق ہے یا نہیں۔ یقیناً نائب ایجوکیشن افسر یہ صلاح ضرور دے سکتا ہے کہ امتحان لیا کس طرح جائے اور یہ بھی کہ ٹیچر امتحان لینا جانتا ہے یا نہیں۔"

"کافی نیا خیال ہے۔" ایجو کیشن افسر نے کہا۔

"جی ہاں۔" میں نے جواب دیا۔

میں امتحانوں کے بارے میں کچھ اور بھی کہنا چاہتا تھا لیکن رات کے کھانے کا وقت ہو چکا تھا۔ وہ جانے کے لیے اٹھے اور مسکرا کر مجھ سے بولے: "اچھا اچھا اب ہم اس کے بارے میں پھر بات چیت کریں گے۔ ارے ہاں کیوں نہ اس موضوع پر ٹیچروں کو ایک لکچر دیا جائے؟"

میں ان سے رخصت ہونے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا اور اپنے آپ سے بولا: "میری تقریر سے ٹیچر کوئی زیادہ عقلمند تو ہو نہیں جائیں گے۔ انھیں امتحان کے موجودہ نظام کے ڈھرے سے نکالنا بڑا مشکل ہے۔ بس ایجو کیشن افسر کے حکم سے ہی تبدیلی ممکن ہو گی۔ لیکن بچارا ____________!"

III

چوتھے درجے کے لڑکوں سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ جغرافیے کی اصطلاحوں اور اصل موضوع کا تھوڑا بہت مطلب جانتے ہوں گے۔ لہذا میں نے کاٹھیاواڑ، گجرات اور صوبہ بمبئی کے نقشے منگوا کر دیوار پر ٹانگ دئیے۔ لڑکوں کو بڑی حیرانی ہوئی۔ میں نے اب تک ایک دن بھی ان کو جغرافیہ نہیں پڑھایا تھا۔

انھوں نے اپنی کاپیوں سے صفحے پھاڑ کر انگلیوں پر چڑھانے کے لیے چھوٹی چھوٹی نلکیاں (Cones) بنانی شروع کر دیں۔

میں نے پوچھا: "کاغذ کی یہ نلکیاں کیوں بنا رہے ہو؟"

لڑکے بولے: "نقشہ یاد کرنے کے لیے۔"

میں چکرا گیا۔ نقشہ یاد کرنے کے لیے؟ جغرافیہ کا اس طرح پڑھایا جانا تو حماقت ہے بالکل! کچھ دیر تفریح کی غرض سے میں نے ایک لڑکے سے نقشے پر بھاونگر دکھانے کو کہا۔ لڑکے نے بمبئی صوبے کے نقشے پر ادھر ادھر نظر دوڑائی۔ اس نے بمبئی، احمد آباد اور حیدر آباد کے نام پڑھے۔ اس نے نیچے نظر ڈالی اور پونے پڑھا پھر ایک طرف دیکھ کر پوربندر پڑھا۔ دو تین لڑکے بھاونگر تلاش کر چکے تھے اور بتانے کے لیے بے چین ہو رہے تھے۔ میرے پوچھے بغیر ہی ایک لڑکے نے نقشے پر بھاونگر دکھا ہی دیا۔

"بھاؤنگر کاٹھیاواڑ کے کس طرف ہے؟ مجھے اس کی سمت بتاؤ۔"

لڑکوں نے اوپر نیچے اور دائیں بائیں نظر ڈالی۔ من ہی من کسی قاعدے سے کچھ حساب لگایا اور بولے: "جی اتر (شمال) میں ہے۔"

دوسرا لڑکا بولا: اتر تو اوپر کی طرف وہاں ہے۔ یہ تو پورب کہلاتا ہے۔" میں اپنی ہنسی نہ روک سکا: "وہاں اوپر تو آسمان ہے۔ تو اتر وہاں کیسے ہو سکتا ہے؟"

دوسرے لڑکے بولے: "نہیں جناب! اوپر کی طرف اتر اور وہاں نیچے دکھن ہے۔"

ایک لڑکے نے کہا: ”جی اتر-دکھن لمبائی میں اور پورب-پچھم چوڑائی میں-“
دوسرا بولا-”پورب ہی سے تو سورج نکلتا ہے-“
میں نے کہا: ”اس نقشے میں سورج کہاں ہے؟ دکھاؤ مجھے-“ لڑکے الجھن میں پڑ گئے-میں نے ان سے پھر سوال کیا: ”اچھا دکھاؤ شترنجی دریا کہاں ہے؟“
لڑکوں نے کاغذ کی نلکیاں لگی انگلیوں سے دریا کی طرف اشارہ کیا-
”اچھا یہ دریا کہاں جا ملتا ہے؟“
”کھمبات کی کھاڑی میں-“
”یہ اس طرف عرب ساگر میں کیوں نہیں ملتا؟“
ایک لڑکے نے کہا: ”شاید یہ دریا کی مرضی ہے-اس نے کھمبات کو ہی چنا-“
”لیکن دریا ادھر نیچے کیوں جا رہا ہے؟“
”قدرتی بات ہے-جناب پانی تو صرف نیچے کی طرف ہی بہے گا-اور دکھن نیچے کی طرف ہے-“

میں حیران تھا-لڑکے پچھلے سال پڑھا ہوا جغرافیہ بھولے نہیں تھے-رٹائی کامیاب ہو گئی تھی-اس سال بھی میں انھیں اسی طرح پڑھا سکتا تھا-لیکن اسے جغرافیہ پڑھانا تو نہیں کہہ سکتے-میں نے لڑکوں سے کہا-”اچھا اب تم لوگ نقشے لپیٹ کر رکھ دو-ہم لوگ جغرافیہ اگلے مہینے پڑھیں گے-ابھی ہم ڈرائینگ کریں گے-“

لڑکے حیران ہو کر میری طرف دیکھنے لگے-ڈرائنگ، اسکول میں ایک نیا مضمون تھا سے نصاب میں شامل نہیں کیا گیا تھا حالانکہ اسکول کو اس طرح کی کم سے کم ایک چیز رکھنی چاہیئے-

اگلے دن میں نے اپنی کلاس کے لڑکوں سے کہا: ”تم لوگ جس چیز کی بھی تصویر بنانا چاہو بناؤ-جو بھی بنا سکتے ہو بناؤ-چاہو تو کہیں سے دیکھ کر بناؤ، تصویر پر باریک کاغذ رکھ کر اتار لو، یا پھر اپنی یاد سے بناؤ-جیسے بھی جی چاہے-تم آدمی یا جانور یا چڑیا، تتلی، پیڑ، پھول، آسمان، ایک گھر یا ایسی ہی دوسری چیزیں یا نقشہ کچھ بھی بنا سکتے ہو-“

بچوں نے اپنی سلیٹوں پر تصویریں بنانا شروع کر دیں-انھوں نے طرح طرح کی چیزیں بنائیں-صبح کا سارا وقت تصویریں بنانے میں ہی نکل گیا-جب گھنٹی بجی تو

ہوش آیا-کلاس کا وقت ختم ہو چکا تھا-

میں نے اپنی کلاس کے لڑکوں سے کہا: دیکھو بچو اگر تمھارے ماں باپ تمھیں کاغذ پنسل دے دیں تو تم کاپی میں بھی تصویریں بنا سکتے ہو، ورنہ سلیٹ پر ہی سہی-“

دو تین دن گذر گئے-اس دوران بہت ساری تصویریں بنائی جا چکی تھیں-ایسی تصویریں جنھیں ایک آرٹسٹ تو اٹھا کر پھینک دے گا لیکن وہ بچوں کی بنائی تصویریں تھیں جو انھوں نے اپنے تخئیل اور اپنی صلاحیت کے اعتبار سے کھینچی تھیں-میں نے انھیں سنبھال کر رکھ لیا-

ایک دن میں ایجوکیشن افسر سے ملنے گیا اور ان سے بڑی مشکلوں سے کچھ ردی کاغذ حاصل کئے، جو ایک طرف سے سادے تھے، میں نے ان سے چند درجن رنگین پنسلیں بھی مانگ لیں-ایجوکیشن افسر مسکرا کر بولے: ”لگتا ہے آپ نے پڑھانا لکھانا چھوڑ دیا اور تصویریں بنوانے لگے ہیں-“

میں نے ڈرائینگ کے الگ الگ عنوانات کے تحت لڑکوں سے ان کی کاپیاں بنوائیں اور کہا کہ وہ ان میں تصویریں بنایا کریں-مناسب سجاوٹ کے لیے میں نے نیم کی چھوٹی چھوٹی ٹہنیاں، پیپل کے پتے، تلسی کی پھنگیاں اور کچھ عام قسم کے پھول لا کر رکھے کپڑے کے ایک بیوپاری سے میں نے کچھ چھپے ہوئے کپڑوں کے نمونے حاصل کئے اور انھیں لا کر کلاس میں لٹکا دیا-میں نے اپنے کچھ دوستوں سے چند اچھی ”پینٹنگز“ (فنکاروں کی بنائی رنگین تصویریں) ادھار لیں اور انھیں کلاس میں لگا دیا تا کہ بچے انھیں دیکھیں-کسی چیز کی تصویر بنانے کے لیے میں نے روزانہ استعمال کی جانے والی چیزیں رکھیں جیسے ایک قلمدان، ایک قلم، ڈبہ، اور ماچس کی ڈبیہ وغیرہ-میں نے بلیک بورڈ پر لکھا:

تصویر بناؤ　　تصویر بناؤ　　تصویر بناؤ
خود سے بناؤ
تصویر بنانا تم جانتے ہو---
تمھاری تصویریں دن بہ دن اچھی ہوتی جا رہی ہیں-

بچوں نے ڈرائنگ میں واقعی ہی دلچسپی دکھائی-کچھ نے تو بیل بوٹے بالکل ویسے ہی بنائے جیسے کپڑے پر چھپے تھے-کچھ نے اپنے پھولوں میں ایسے رنگ بھرے جیسے

اصلی پھول کے ہوں ۔ بعض لڑکوں نے تصویریں نہیں بنائیں ۔ وہ بس بیٹھے دوسروں کو بناتا دیکھتے رہتے ۔

کوئی پندرہ دن کے بعد میں ہائی اسکول کے ڈرائنگ ٹیچر کو بلا کر لایا۔ وہ آئے تو میں نے ان سے کہا : "دیکھئے میں یہ نہیں چاہتا کہ آپ لڑکوں کو تصویریں بنانا سکھائیں ۔ آپ صرف یہ کریں کہ بلیک بورڈ پر جو جی چاہے بناتے جائیں ۔ بس اتنا کیجئے گا کہ تھوڑا آہستہ بنائیے گا اور ایک حصے کے بعد دوسرا حصہ بنے ۔ آپ کرسی یا پیڑ جو چاہیں بنائیں ۔"

ڈرائنگ ٹیچر نے ایسا ہی کیا ۔ لڑکے بڑے غور سے انھیں بناتے دیکھتے رہے ۔ ایسا لگ رہا تھا کہ لڑکے تصویر بنانے کی تکنیک کو تھوڑا بہت سیکھ رہے تھے ۔ پھر میں نے ان سے کہا کہ اپنی بنائی ہوئی تصویروں پر نام اور تاریخ لکھ دیا کریں ۔

تھوڑے دنوں کے بعد میں نے ڈرائنگ ٹیچر کو پھر بلایا اور ان سے درخواست کی کہ وہ تصویر میں رنگ بھرنے کی تکنیک خود تصویر میں رنگ بھر کر دکھائیں ۔ انھوں نے رنگین پنسلوں سے تقریباً پانچ تصویروں میں رنگ بھر کر دکھائے ۔ لڑکوں کے لیے ایک نیا دروازہ کھل گیا۔

تھوڑے دن کے بعد میں نے سروے کرنے والے اپنے ایک دوست کو بلایا اور ان سے کہا کہ کمروں وغیرہ کا ناپ لے کر وہ اسکول کا ایک نقشہ تیار کریں ۔ میں نے اور انھوں نے مل کر ناپ لینا شروع کیا۔ لڑکے ہم لوگوں کے ساتھ ساتھ گھوم رہے تھے اور ہمیں کام کرتے دیکھ رہے تھے ۔ ہم نے انھیں دکھایا کہ کسی عمارت کا نقشہ کاغذ پر کس طرح بنایا جاتا ہے ۔ میں کئی بار لڑکوں کو سروئیر صاحب کے پاس لے گیا اور دکھایا کہ پیمائش کرنے والے کس طرح سڑکوں ، گاووں ، کھیتوں ، جنگلوں وغیرہ کے نقشے تیار کرتے ہیں ۔ ایک دو بار سروئیر دوست کے ساتھ میں ، لڑکوں کو ان جگہوں پر بھی لے گیا جہاں سچ مچ زمین کا سروے کیا جا رہا تھا۔

اب لڑکے اسکول کی عمارت ، اپنے گھروں ، کلاس روم کنوئیں اور تالاب وغیرہ کی بھی تصویریں بنانے لگے ۔ میں لڑکوں کو کبھی کبھی قدرتی مناظر کے ماحول میں بھی لے جایا کرتا تھا کہ وہ نظارے دیکھنے کا کھیل کھیلیں اور ایک نظر میں دیکھی ہوئی چیزوں کا تصور کرلیں اور پھر بعد میں ان کی تصویریں بنا سکیں ۔ میں نے انھیں صبح سویرے سورج نکلتے ،

اور شام کو سورج ڈوبتے وقت آسمان میں بکھرے رنگ دکھائے ۔ میں نے پیڑوں وغیرہ کو دور اور نزدیک سے دکھایا تا کہ وہ جانیں کہ کسی چیز کا دور اور نزدیک کیا ہوتا ہے ۔ میں نے انھیں پیڑوں ، پہاڑوں ، انسانوں اور دوسری چیزوں پر روشنی اور سایہ پڑتے دکھایا۔

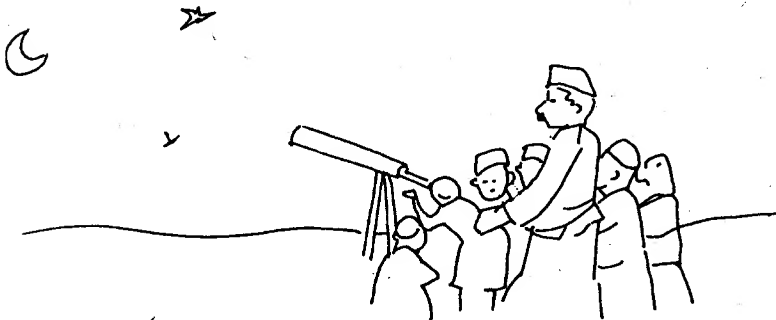
ہماری ڈرائنگ کا کام زور وشور سے چل رہا تھا۔

IV

ایک روز ہائی اسکول سے میں ایک دوربین لے آیا۔ میں نے لڑکوں کو دکھایا کہ کیسے بہت دور کی چیزیں دوربین سے نزدیک دکھائی دیتی ہیں ۔ لڑکے حیران رہ گئے سارے دن وہ باری باری دوربین سے چیزیں دیکھنے میں ہی لگے رہے ۔ پھر ایک دن میں رات کو سیارے اور تارے دیکھنے کے لیے ایک بڑی دوربین (ٹیلیسکوپ) لے آیا۔ میرے دوست کہنے لگے ۔ "بھئی تم تو بڑے ہی محنتی ہو !"

ایسے موقعوں پر میرے دوست ٹیچر میرے ساتھ ہی رہا کرتے تھے ۔ وہ مجھے بدنام کرنا چھوڑ کر اب مجھ سے کچھ سیکھنے کی طرف مائل تھے ۔ ایجوکیشن ڈائریکٹر نے انھیں اجازت دے دی تھی کہ ہفتے میں ایک گھنٹہ وہ میری کلاس میں آ کر دیکھ سکتے ہیں کہ کیسے پڑھاتا ہوں ۔ رات کو میں نے اپنے شاگردوں کو بڑی دوربین ۔ سے چاند تارے اور سیارے دکھائے ۔





رات میں ستاروں اور سیاروں کو دوربین سے دیکھتے ہوئے بچے اور ساتھ میں لکشمی شنکر۔

ان کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔

میں نے انھیں چاند دکھا کر کہا: "بچو تم نے سنا ہو گا کہ ایک بڑھیا چاند پر بیٹھی چرخا کات رہی ہے اور اس کی ایک بکری بھی ہے۔ دراصل یہ جو دھبے نظر آتے ہیں وہ چاند پر موجود بڑی بڑی کھائیاں اور پہاڑ ہیں۔ چاند پر تو اس قدر سردی ہے کہ کسی بھی جاندار چیز کا وہاں ہونا ناممکن ہے۔"

لڑکے حیرانی سے مجھے دیکھتے رہے اور میں نے بات جاری رکھی۔ "دیکھا جائے تو زمین جس پر ہم رہتے ہیں، وہ اور چاند ایک طرح سے بہنیں ہیں اور سورج ان کا باپ ہے۔"

لڑکے اور زیادہ حیران ہوئے۔

ایک لڑکے نے پوچھا: "یہ بات کہانی کی کس کتاب میں ہے؟"

"یہ کوئی خیالی کہانی نہیں بلکہ حقیقت ہے۔"

"ارے نہیں!"

"کیا واقعی!"

میں نے انھیں یہ بتانا شروع کیا کہ زمین کیسے بنی تو انھوں نے بڑی دلچسپی دکھائی۔ پھر میں ہر روز یہ کہانی بتاتا گیا۔ میں نے انھیں بتایا کہ زمین ٹھنڈی پڑ جانے کے بعد کیسے اس کی اوپری پرت بنی؟ پہاڑ اور وادیاں کس طرح بن گئے۔

کیسے کائی، (Amoeba) مچھلی، مینڈک، جل تھل یا جانور، جنگلات، اور بہت پرانے زمانے کے انسان نما جانور بتدریج آج کے انسانوں میں بدل گئے۔ یہ ساری کہانی اس قدر دلچسپ تھی کہ لڑکے بڑے دھیان سے سنتے رہے۔ ہیڈ ماسٹر صاحب نے ساتویں درجے کے لڑکوں کو بھی میری اس کلاس میں بیٹھنے کو بھیج دیا تاکہ وہ یہ سب سنیں۔

ایک دن میں زمین کا ایک گلوب خرید کر لایا اور کہا "دیکھو، ہماری دنیا کچھ ایسی ہی ہے۔"

پھر میں نے لڑکوں کو بتایا کہ زمین پر کتنا حصہ خشکی کا ہے اور کتنا پانی کا۔ میں نے وہ جگہیں بتائیں، جہاں انسانوں کی مختلف قومیں بستی ہیں، یعنی کالے گورے، بھورے اور پیلے لوگ رہتے ہیں۔ میں نے لڑکوں کو کرہ زمین کے قدرتی خطے اور ان کے نام بتائے۔ پھر میں نے بتایا کہ ہم لوگ ایشیا میں رہتے ہیں۔ میں نے انھیں ایشیا میں

ہندوستان کو دکھایا اور ہندوستان کے اندر کاٹھیاواڑ جہاں کاٹھی لوگ بستے ہیں۔ میں نے انھیں دکھایا اور پھر بتایا کہ کاٹھیاواڑ میں بھاؤ نگر کہاں ہے۔

پھر میں نے لڑکوں سے کہا: "لو یہ گلوب۔ اور نقشے کے اسٹینڈ پر سے وہ نقشے اٹھاؤ اور پھر دیکھو کہ گلوب پر یہ نقشے کس حصے میں دکھائے گئے ہیں۔"

میں لڑکوں کو روزانہ کوئی نہ کوئی نئی بات نقشوں یا گلوب پر دیکھنے کو دینے لگا۔ میں نے ان سے نقشوں میں وہ علاقے تلاش کرنے کو کہے جہاں وہ کبھی گئے ہوں اور کہا کہ ان کا راستہ بھی معلوم کریں۔ میں نے ان سے یہ بھی دیکھنے کو کہا کہ اس راستے پر سفر کرتے ہوئے کون سے شہر اور کون سی ندیاں پڑیں گی۔

ایک طریقہ تو یہ ہوا۔ ایک دوسرا طریقہ بھی تھا۔ میں افریقہ ہو آیا تھا۔ اس لیے میں نے افریقہ کے ایک نقشے کی مدد سے جسے بورڈ پر لگا دیا جاتا تھا وہاں کے بارے میں بتانا شروع کیا۔ میں نے انھیں وکٹوریہ، نیازا، ٹنگانیکا اور دریائے نیل اور زامبیسی وغیرہ کے بارے میں بتایا۔ میں نے افریقی لوگوں یعنی مسائی اور کووی رانڈا لوگوں کا حال سنایا۔ پھر میں نے ایک دن لڑکوں سے کہا۔ "کیوں نہ ہم لوگ اپنے آس پاس رہنے والے لوگوں جیسے کولی، رباڑی، کمہار، گڈریا وغیرہ کے یہاں چلیں اور ان سے مل آئیں۔"

یہ کہہ کر میں نے لڑکوں کو گاؤں، پہاڑوں، دریاؤں اور گاؤں کے آس پاس کے علاقوں میں لے جانے کا انتظام کیا اور انھیں چھوڑ دیا کہ وہ خود ان جگہوں کی تاریخ وغیرہ کا حال معلوم کریں۔ پھر میں نے جغرافیہ کی کتابوں کی ایک لائبریری بنانے کا سوچا لیکن مجھے گجراتی زبان میں مختلف علاقوں کے سفر کے بارے میں اچھی کتابیں نہیں مل سکیں۔ بہرحال جو بھی کتاب ملی میں نے لڑکوں کو دی اور کہا: "لو یہ کتابیں پڑھو لیکن پڑھتے ہوئے نقشے پر نظر ضرور رکھنا۔ دیکھتے رہو کہ مسافر کہاں کہاں جاتا ہے اور تم بھی اس کے ساتھ گھومو۔"

بچے سفر نامہ پڑھنا پسند کرتے ہیں۔ کئی لڑکوں کو تو کاٹھیاواڑ کی انسائیکلوپیڈیا بہت اچھی لگی۔ وہ نقشے پر کوئی گاؤں چن لیتے اور پھر اس کے بارے میں انسائیکلوپیڈیا میں سب کچھ پڑھ ڈالتے۔ انھوں نے روی بھائی راول کی پینٹنگ اور ڈرائنگ سے احمد آباد کے بارے میں بہت کچھ جان لیا۔ کتنا اچھا ہوتا اگر ہمارے پاس سب اہم جگہوں کے تصویری البم ہوتے! ایک دن روی بھائی ہماری کلاس میں آ گئے۔ ان کے پاس مدراس کے بارے میں

ایک فلم تھی ۔ میں نے بچوں کو یہ فلم دکھائی ۔ سینما تعلیم دینے کا ایک بہت مفید ذریعہ بن سکتا ہے ۔ دور دراز جگہوں کے اصلی مناظر دکھانے سے جغرافیے میں دلچسپی بڑھتی ہے ۔ اتفاق سے تاش کی ایک گڈی میرے ہاتھ لگ گئی جو سیزر سگریٹ کمپنی نے بنائی تھی ۔ اس پر مختلف ملکوں کے باشندوں کی تصویریں بنی ہوئی تھیں ۔ میں نے لڑکوں کو وہ تصویریں دکھائیں ۔ یہ سب کرنے سے میرا یہ مقصد ہرگز نہیں تھا کہ میں انھیں ساری دنیا کے بارے میں پڑھاؤں ۔ مجھے بالکل توقع نہیں تھی کہ لڑکے سب کچھ یاد کرلیں گے ۔ میری خواہش صرف اتنی تھی کہ لڑکوں کو معلوم ہوجائے کہ یہ دنیا بہت بڑی ہے ۔ اس کے بارے میں جاننے والی بہت سی دلچسپ باتیں ہیں اور انھیں جاننے کے ذریعے بھی بہت ہیں ۔ بس میں اتنا ہی چاہتا تھا !

میں نے ایک نیا کھیل نکالا ۔" آؤ سفر کریں ۔" ہم سوچ لیتے تھے کہ ہم بھاؤ نگر سے احمد آباد، دوارکا، بمبئی، ہمالہ پہاڑوں پر اور یہاں تک کہ انگلینڈ جارہے ہیں ۔ پھر ہم پلان بناتے کہ یہ سفر کیسے کریں ۔ کونسی ٹرینیں لیں، انھیں کہاں بدلیں گے، راستے میں دیکھنے کے قابل کونسی جگہیں ہوں گی، سفر میں اندازاً کتنا وقت لگ جائے گا، کس کس سے ملاقات کریں گے، کیا خریداری کریں گے وغیرہ وغیرہ ۔" ہم لوگ پورے خرچے کا بھی اندازہ لگاتے ۔ ہم گائیڈ بک سے اہم مقامات کے نام لکھ لیتے ۔ جغرافیے کی معلومات کے مطابق ہم غور کرتے کہ ہر جگہ سے کیا کیا چیزیں خریدنے کے لائق ہوں گی ۔ ہم ہر بات کا تفصیل سے مطالعہ کرتے جیسے سچ مچ ہی سفر پر جارہے ہوں ۔ جغرافیہ پڑھانے کا میرا پروجیکٹ اس طرح کا ہوتا تھا ۔ باقی باتیں میں لڑکوں پر چھوڑدیتا ۔ کبھی کبھی ایسا ہوتا کہ وہ اس بات کی معلومات کرتے کہ ماچس کی ڈبیہ کہاں سے آتی ہے ۔ کبھی یہ جاننا چاہتے کہ یہاں کاشت کی ہوئی روئی برطانیہ کیسے اور کن راستوں سے جاتی ہے ؟ اکثر وہ بازار کی دوکانوں میں جا کر پوچھتے کہ اس دوکان کا کون ساسامان کس ملک سے آیا ہے ؟ کبھی کبھی وہ Antakshari کا کھیل کھیلتے اور دریاؤں شہروں ملکوں اور پہاڑوں وغیرہ کا نام لیتے ۔ لڑکوں نے ایسے نقشے بھی بنائے جن میں گاؤں، ندیاں پہاڑ اور دوسری قدرتی چیزیں جو کہ انھوں نے دیکھی تھیں یا جن کے بارے میں پڑھا تھا تفصیل سے بنا کر دکھائی جاتیں ۔ زیادہ معلومات حاصل کرنے کے لیے وہ جغرافیہ کی کتابیں بھی دیکھ لیتے ۔

تو اس طرح جغرافیے کی پڑھائی آگے بڑھتی رہی ۔ پھر بھی میرے کئی ساتھی ٹیچر زیادہ خوش نہیں تھے ۔ وہ کہتے ۔" بھئی یہ سب کام تو صرف تم ہی کرسکتے ہو ۔ آپ سوچئے اب اتنی ساری معلومات آخر ہم کہاں سے حاصل کریں گے؟ اس طرح سے جغرافیہ کی بات نہیں کرسکتے ۔"

لیکن مجھے لگتا وہ لوگ بھی یہ سب کرسکتے ہیں ۔ بس ضرورت صرف محنت اور جوش وخروش کی ہے ۔

V

سالانہ امتحان قریب آتا جارہا تھا ۔ میں اپنے کام کا جائزہ لینے لگا تو حساب کا خیال آیا ۔ یہ نہیں کہ میں نے اس وقت تک حساب کو ہاتھ نہ لگایا ہو ۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ ابھی تک میں نے یہاں اس کا کوئی ذکر نہیں کیا ہے ۔ میں نے لڑکوں کی حساب کی جانکاری کا امتحان لینے کے لیے، جب انھیں سوال دئیے جو وہ پچھلے درجوں میں سیکھ چکے تھے تو انھوں نے وہ سارے سوال حل کردئیے ۔ پہلے تو میں نے یہی سوچا کہ وہ اس مضمون میں خاصے ہوشیار ہیں ۔ ایک طرح سے میرے خیال میں یہ اچھا ہی تھا کیونکہ اب میں اس مضمون میں کوئی خاص نئی چیز تو سکھا نہیں سکتا تھا، کیونکہ وقت کم تھا ۔ لیکن جب میں نے لڑکوں سے سوال حل کرنے کی منطق اور طریقہ پوچھا تو وہ بتا نہ سکے ۔

مجھے محسوس ہوا کہ لڑکے جوڑنا، گھٹانا وغیرہ تو ضرور جانتے تھے لیکن یہ جانکاری صرف رٹنے کا نتیجہ تھی ۔ یہ سوچ کر مجھے پریشانی ہوئی کہ اب میں اس بارے میں کیا کروں ؟ پہلی بات تو یہ کہ حساب کا مضمون مجھے خود ہی پسند نہیں تھا ۔ یہ بات تو میری سمجھ میں آتی تھی کہ حساب سکھانے کا موجودہ طریقہ غلط ہے لیکن میں نے اس پر زیادہ غور نہیں کیا تھا کہ اسے درست کرنے کے لیے ہمیں کیا کرنا ہوگا ۔ اب میرے سامنے ایک بڑا مسئلہ کھڑا ہوگیا چنانچہ میں سیدھا ایجوکیشن افسر کے پاس پہونچا اور کہا : " جناب ! اب میں حساب میں کوئی نئی

چیز نہیں کرپاؤں گا۔ میں بس لڑکوں کا کورس پورا کرادوں گا اور فارمولوں کو انھیں اچھی
طرح سمجھادوں گا۔ بس میں اتنا ہی کرسکتا ہوں۔"

"کیوں؟ کیا حساب پڑھانے میں کسی تبدیلی کی ضرورت نہیں ہے؟"

"جی ہے تو ضرور۔ لیکن بہت بنیادی تبدیلی ہونی چاہئے۔ ہمیں اس وقت سے
جب بچہ گنتی سیکھنا شروع کرتا ہے، مناسب طریقہ اپنانا ہوگا۔ حساب تو ایک ایسا مضمون
ہے کہ اگر بنیادی اصول ذہن میں صاف نہ ہوں تو بچہ ہمیشہ ہی کمزور رہتا ہے۔"

"تو پھر ابتداء سے ہی حساب سکھانا شروع کیجئے نا؟" ایجوکیشن افسر نے کہا۔

"اس کے لیے وقت ہی کہاں رہ گیا ہے اور اگر ہمارے پاس وقت ہوتا بھی تو
لڑکے رٹ کر سوال کرنے کے عادی ہو چکے ہیں اور انھیں سوال حل کرتے ہوئے کیوں اور
کس لئے؟ کی کوئی فکر نہیں ہوتی۔ انھیں نئے راستے پر چلانا تو بڑا مشکل ہے۔"

"لیکن پھر ان کا حساب ---------؟"

"یوں تو میں جہاں تک ہوسکے گا انھیں کرادوں گا لیکن جو بات میں کہنا چاہتا ہوں،
وہ یہ ہے کہ حساب پڑھانے کے سلسلے میں جو کچھ تجربے کئے جاسکتے تھے وہ اب اس وقت
ممکن نہیں ہیں۔"

"اچھا فرض کیجئے آپ کو پڑھانے کے لیے پہلی کلاس ہی دیدی جائے۔ کیا تب
آپ حساب سکھانے کے نئے طریقے استعمال کرکے دیکھیں گے؟"

"جی ہاں۔ میرا ارادہ تو یہی ہے کہ گنتی سکھانے کے وقت سے ہی نئے طریقوں کا
استعمال شروع کردوں۔ تب ہی میں دوسروں کو یہ دکھاسکوں گا کہ کوئی ایک خاص طریقہ
بہتر ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ میرے بعض دوست ٹیچر اس سے دلچسپی رکھتے ہیں کہ حساب
پڑھانے میں نئے طریقے استعمال کئے جائیں۔ اگر خوش قسمتی سے مجھے اگلے سال بھی
تجربے جاری رکھنے کا موقعہ ملا تو شری چندر شیکھر اور میں، دونوں اس سلسلے میں ایک تجربہ
کریں گے۔ میرا خیال ہے کہ حساب سکھانے کا مونٹیسری طریقہ اچھا ہے۔ یہ طریقہ قدرتی
ہے میں نے اس کے بارے میں پڑھا ہے، اور اس پر کچھ غور بھی کیا ہے۔ لیکن ظاہر ہے
ابھی تک اس پر واقعی عمل نہیں کرپایا ہوں۔"

"تو پھر کیا اگلے سال نائب ایجوکیشن افسر کا عہدہ قبول کرکے ٹیچرس ٹریننگ

انسٹی ٹیوٹ میں حساب پڑھانے میں تجربے کرنے کا کام سنبھالیں گے؟"

"اسے تو قسمت کے لکھے پر چھوڑیئے۔ دراصل اس وقت جو بات مجھے کہنی ہے وہ
یہ ہے کہ میں اس سال حساب میں کوئی خاص نئی بات کرکے نہیں دکھاسکوں گا۔"

VI

سالانہ امتحان اور قریب آگیا۔ میں اپنے ڈھنگ سے لڑکوں کو اس کے لیے تیار
کرنے لگا۔ وہ بڑے جوش وخروش سے کام کررہے تھے۔ مجھے پورا بھروسہ تھا کہ امتحان میں
میرے درجے کے لڑکے ضرور کامیاب ہوجائیں گے۔

آخر امتحانات شروع ہوگئے۔ ایجوکیشن افسر نے دوسرے درجوں کے امتحانات
پہلے کرائے پھر میرے لڑکوں کی باری آئی۔ شروع سے ہی یہ بات طے تھی کہ میرے
درجے کے لڑکوں کا امتحان خود ایجوکیشن افسر لیں گے۔ انھوں نے مسکرا کر کہا: "میں
آپ کی کلاس کا امتحان نہیں لوں گا۔ میں آپ کی کلاس کے سبھی لڑکوں کو آگے کے درجے
میں چڑھا رہا ہوں۔"

"جی نہیں۔ ایسے کام نہیں چلے گا۔ اس طرح بعض لڑکوں کے ساتھ ناانصافی
ہوگی۔"

"یہ لڑکوں کے ساتھ ناانصافی کیسے ہوگی؟"

میں نے خود کہا: "جو درجہ چڑھائے جانے کے قابل نہیں ہیں۔ انھیں نہیں
چڑھایا جاسکتا۔"

"لیکن مجھے یقین ہے کہ آپ نے پوری کلاس کو بڑی اچھی طرح پڑھایا ہے۔ مجھے
آپ کے پڑھانے کی اہمیت کا اعتراف ہے۔"

"ہوسکتا ہے ایسا ہی ہو۔ لیکن کیا ہر لڑکے نے اچھی طرح سیکھا ہے؟ سچی بات تو یہ
ہے کہ بعض لڑکوں نے کچھ بھی نہیں سیکھا اور کورے کے کورے ہیں۔"

"تو پھر آپ نے کیا سوچا ہے؟ ہمیں ان کے بارے میں کیا کرنا چاہئے ؟"

"ان میں سے چند لڑکوں سے کہنا پڑے گا کہ وہ اسکول چھوڑدیں ۔ راگھونائی کے بیٹے کو تاریخ، جغرافیہ یا حساب سے کوئی دلچسپی نہیں ہے وہ اسکول میں کچھ نہیں کرپارہا ہے لیکن وہ کافی ہوشیار ہے اور کئی نائیوں کی ٹیم کا لیڈر بن کر حجامت کی ایک بڑی دوکان کو کامیابی سے چلاسکتا ہے ۔ اسے بال کاٹنے اور ہیرکٹنگ سیلون چلانے کا انتظام سیکھنے کے لیے بمبئی بھیج دینا چاہئے ۔"

"اچھا ٹھیک ہے ۔ اور کون کون اسکول میں پڑھنے کے قابل نہیں ہے ؟ "

"جی یہ بات نہیں کہ وہ اسکول کے ناقابل ہیں ۔ دراصل یہ اسکول ہی ان کے لائق نہیں ہے ۔ ان میں جس کام کی صلاحیت ہے ،اس کے بارے میں اس اسکول میں تعلیم کا انتظام نہیں ہے ۔"

"اچھا ۔ یونہی سہی ۔ لیکن وہ لڑکے ہیں کون کون ؟"

"جیون سیٹھ پولیس محکمے کے لیے بڑا مناسب ہے ۔ ہم کو اسے کسی جمنیزیم میں داخل کرادینا چاہئے ۔ اس کے باپ کو مشورہ دینا چاہئے کہ وہ اس کے سفر کا بھی انتظام کریں ۔ اسے کسی اچھے پولیس افسر کے تحت کام سیکھنا چاہئے ۔ اسے تھوڑا بہت قانون بھی پڑھنا چاہئے ۔ پانچ سال کے اندر وہ ایک اچھا حولدار بن جائے گا ۔ ابھی سے اس کا انداز اسکول میں ایک حولدار ہی جیسا ہے ۔"

"چلئے مانا ۔ بتائیے اور کون کمزور ہے ؟"

"تین بچے اور پڑھائی میں کمزور ہیں ۔ میں آنے والی چھٹیوں میں ان کی تیاری کراؤں گا تاکہ وہ درجہ چڑھادیئے جائیں ۔ لیکن جناب کیا ہمارے نصاب کی مشکلات اور اسکول کے معیار کا کوئی علاج نہیں ہے ؟"

"اسے تو آپ چھوڑیئے ۔" ایجوکیشن افسر نے کہا "اس سلسلے میں میرے ہاتھ پاؤں بندھے ہوئے ہیں ۔ میں کئی بار آپ کو یہ بتا بھی چکا ہوں ۔ اچھا اب آپ کی کلاس کا امتحان ختم ہوا ۔ چھ ماہی امتحان کی طرح اس مرتبہ بھی آپ نے معلوم ہوتا ہے کچھ تیاری کی ہے ۔ اب میں آپ کے پڑھانے کے ڈھنگ کو سمجھ گیا ہوں ۔"

VII

امتحانوں کے بعد انعامات تقسیم کرنے کا دن آیا ۔ ہر سال جو لڑکے زیادہ نمبر پاتے تھے انھیں انعام دیا جاتا تھا ۔ شہر کے معزز لوگ اور سرکاری افسر اس موقعہ پر موجود رہتے ۔ ایجوکیشن افسر نے مجھ سے کہا کہ اس مرتبہ سارے دن کے پروگرام کا انتظام میں کروں ۔ میں نے یہ کام اپنی کلاس کے لڑکوں کے سپرد کردیا ۔ انھوں نے مجھ سے مشورہ کرکے سارا انتظام کرلیا ۔

سب سے پہلے ڈانڈیہ راس شروع ہوا (یعنی ڈنڈوں کی تال پر ناچ) تقریباً آدھے گھنٹے تک دیکھنے والوں پر محویت کا عالم طاری رہا ۔ اس کے بعد طرح طرح کی دوڑ ہوئی ۔ لنگڑی دوڑ، تین پیروں والی دوڑ، امرود کھاؤ دوڑ، کودائی دوڑ اور پھر میوزیکل چیئر یعنی کرسی دوڑ وغیرہ ۔ لوگ یہ سب بڑی دلچسپی اور شوق سے دیکھ رہے تھے ۔ دوڑ کے بعد چھوٹے چھوٹے ناٹک، اور نقلیں ہوئیں، جو ایک دوکاندار، ڈائریکٹر آف ایجوکیشن، ایک پولیس افسر اور ایک سیاسی لیڈر کے بارے میں تھیں ۔ یہ سب کچھ بھی بڑی اچھی طرح ہوا ۔ طالب علم اپنی بنائی ہوئی تصویریں لائے اور ہر مہمان کو ایک تصویر تحفے کے طور پر دی ۔ سب نے ہی بچوں کی بنائی تصویروں میں گہری دلچسپی دکھائی ۔

اب انعام تقسیم کرنے کا وقت آیا ۔ ہر سال سوا سو روپئے کے انعامات تقسیم کئے جاتے تھے اور یہ ذہین لڑکوں کو ہی ملتے تھے ۔ ڈائریکٹر آف ایجوکیشن کھڑے ہوگئے اور اپنے انداز میں کہنے لگے : " دوستو ۔ میرا خیال ہے کہ اس بار کا پروگرام دوسری طرح کا تھا ۔ یہ جو صاحب میری بغل میں بیٹھے ہوئے ہیں ،انھوں نے انعامات کے بارے میں مجھے ایک نیا سبق سکھایا ہے ۔ اس سال میں ایک سو پچیس (۱۲۵) روپئے کے انعامات الگ الگ لڑکوں کو نہیں دوں گا ۔ میں یہ ساری رقم اسکول میں ایک لائبریری کھولنے کے لیے دوں گا جو ان صاحب کے نام پر ہوگی ۔ جنھوں نے مجھے یہ نیا سبق سکھایا ۔ مجھے آپ کو یہ بتانے میں بڑی مسرت ہورہی



تین پیر کی دوڑ۔

ہے کہ اعلیٰ افسروں نے روپئے کو اس طرح خرچ کرنے کی اجازت دیدی ہے اور اب ہر سال انعامات کی رقم لائبریری کو بڑھانے پر خرچ کی جائے گی۔ الگ الگ لڑکوں کو انعام دینے سے انعام پانے والوں میں گھمنڈ اور دوسروں میں مایوسی پیدا ہوتی ہے۔ انعام کی رقم کا یہ نیا انتظام ایسا ہے جس سے سبھی فائدہ اٹھا سکیں گے۔ میں سب کے سامنے ان صاحب کا شکریہ ادا کرتا ہوں جنھوں نے مجھے احساس دلایا کہ انعام دینے کا طریقہ بالکل بے فائدہ ہے اور انعام کو بہتر طریقے پر استعمال کرنے کا طریقہ بتایا۔ اب میں آپ کو یہ بھی بتانا چاہوں گا کہ جب یہ صاحب پچھلے سال میرے پاس درخواست لے کر آئے کہ انھیں پرائمری اسکول کے درجہ چار میں تجربہ کرنے کی اجازت دی جائے تو میں نے انھیں ایک بے عمل احمق خیال کیا تھا

"میں نے سوچا تھا کہ یہ بھی بہت سے دوسرے لوگوں کی طرح ہی ہوں گے اور جب ان کو سخت مشکلات کا سامنا ہوگا تو پہلا موقعہ پاتے ہی بھاگ کھڑے ہوں گے۔ پھر بھی میں نے انھیں اجازت دیدی تھی۔ مجھے ان پر بھروسہ نہیں تھا۔ لیکن مجھے یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ انھیں اپنے تجربے میں کامیابی ملی ہے۔ انھوں نے میرے بھی خیالات بدل دئیے ہیں۔ مجھے اس بات کا پکا یقین ہوگیا ہے کہ ہم پرائمری تعلیم کے پرانے ڈھرے کو ختم کر سکتے ہیں۔ ٹیچروں اور میرے جیسے افسروں کو چاہئے کہ وہ رضا کارانہ طور پر ریٹائر ہوجائیں اور نئی

نسل کے، نئی سوچ والے ماہرین تعلیم کے لیے جگہ خالی کردیں۔

"میں کس طرح اپنی خوشی کا اظہار کروں؟ ذرا ان کی کلاس کے بچوں کو دیکھئے۔ کس قدر مہذب، صحت مند اور خوش نظر آرہے ہیں۔ میں ان کی ترقی اور نشوونما دیکھتا رہا ہوں اور ان کے والدین نے اکثر مجھ سے اپنے اطمینان کا اظہار کیا ہے۔"

ڈائریکٹر صاحب کی تقریر ختم ہوئی۔ سب لوگ چلے گئے اور میں گھر آگیا۔

Laser typeset at Fine Composing Centre,80-A,Street No.7,
Ghaffar Manzil Extn., Jamia Nagar, New Delhi- 110025,and
printed at Ravindra Offset Press, New Delhi-32